
قیسی رامپوری
آنچ

آتش

آنچ

[ناول]

قیسی رامپوری

ادارۂ فروغِ اردو لاہور

طبع ثانی

قیمت روپے

محمد طفیل پرنٹر و پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کی

(۱)

سنا تھا کہ بمبئی بڑا بارونق اور عظیم الشان شہر ہے۔ جب دیکھا تو اسے حقیقتاً ایسا ہی پایا۔ وہاں کی جاترا کی تو جو کانوں نے سنا تھا وہی دیکھا ——— جہازوں کا دھواں، موٹروں کی چیخم دھاڑ، ملوں کا شور وغل اور ساتھ ہی عاشقوں کی ٹھنڈی آہیں اور اس پر مسکرا کر حسینانِ شہر کا تبصرہ ——— "اچھا جی"۔

کئی ایسے بھی اللہ والے دیکھے کہ کئی کئی فاقوں سے ہیں اور زبان سے یہی کہہ رہے کہ ——— یا اللہ تیرا شکر۔

لیکن یہ سب کچھ کہاں نہیں ہے؟ کسی بڑی سے بڑی یا چھوٹی

سے چھوٹی بستی میں چلے جائیے ہر طرف بھوک افلاس ــــ بستی کو جانے دیجئے اکیلے انسان کو لے لیجئے۔ بیٹھا ہوا جل رہا ہے۔ بھُن رہا ہے۔ اور پھر بھی نہیں مرتا۔ یہ تو کوئی مرنا نہیں ہے کہ وسائل کے پشتارے لادے ہے آدمیوں کی پلٹن کسی کو کچلتی ہوئی گذر گئی، کچلا جانے والا تڑپا، سسکیاں لیں اور پھر نہ اُٹھنے کا وعدہ کر کے ہمّت ہار بیٹھا۔ یہ موت کب تھی۔ اگر واقعی یہ موت تھی تو پہلے وہ کچلنے والی، وسائل کی پلٹن ٹھنڈی ہوتی۔ تلوار کتنی ہی آبدار ہو لیکن جب وہ حلق کے پار ہوتی ہے تو اس پر خون کا دھبہ لگ ہی جاتا ہے۔ اور پھر یہ دھبہ زنگ بن کر اس کو چاٹ لیتا ہے۔ خون ایک ہی ہے تلواریں مختلف ہو سکتی ہیں لیکن ایک خون تمام تلواروں کو زنگ آلود کر دینے کے لئے کافی ہے۔ بھلا اس سے موت کی دسترس کب باطل ہوتی ہے۔ کچلا ہوا انسان تو مر ہی گیا ــــ حالانکہ وہ مرا نہیں ہے۔ ابھی تو اس کے خون میں گاڑھا پن، سُرخی اور بُو موجود ہے۔

خُون کی سُرخی کہیں چھپ کر کالی کالی اور سخت ہو جاتی ہے اور پھر اُس کی بدبُو پھیلے بغیر بھی نہیں رہتی یہ جُرم کا کیمرہ ہی ہے خواہ مبئی

کی گنجان بستی ہو یا جنگل کا بھیانک ویرانہ، جہاں کہیں خون کی بوند گری یا گرائی گئی وہی تصویر اس کیمرے میں آئے بغیر نہیں رہتی بعض اوقات خارجی رکاوٹوں سے اس کیمرہ کا لینس دھندلا ہو جاتا ہے تو ایک اور لینس اس میں فٹ ہو جاتا ہے اور وہ لینس خود انسان ہی ہے اپنی پوری ہستی لئے ہوئے انسان جس کی پلیٹ پر باقتضائے ضرورت سے لے کر بلا ضرورت تک بہے ہوئے تمام خون کی تصویر آجاتی ہے۔

معلوم نہیں اور بیماریوں میں جراثیم ہوتے ہیں یا نہیں مگر خون میں ضرور ہیں اور وہ جرم کے جراثیم ہیں ہر وہ خون جو ٹپکا ہے یا بہا ہے وہ ایک چھوٹی سی جرم کی تاریخ رکھتا ہے۔ قدرت نے جسم کو جو خون بخشا، وہ بقائے حیات کے لئے نہیں، بلکہ سراغ جرم کے لئے ہے۔ اگر تم اسے کہیں بہتا ہوا پاؤ تو سمجھ لو کہ یہاں سے جرم کی ابتدا ہوئی اور یہ جرم یہیں ختم نہیں ہوا بلکہ اس نے کسی گروہ یا فرد کی طرف رُخ کیا ہے۔ ہو سکے تو اس کا کھوج لگاؤ، اور زمین کو جرائم کا گہوارہ بننے سے بچا لو۔

جرائم کی اس دنیا میں ہزاروں آدمی سانس لے رہے ہیں اور ان کے سانس کے ساتھ صدہا جرائم ان کے جسم میں داخل ہو گئے ہیں کیسی عجیب

غریب زندگی ہے انسان کی۔ ہم میں سے بہت سے نہیں چاہتے کہ گناہ کے پاس پھٹکیں، مگر غیر ارادی طور پر، نامعلوم کیا مقتضیات پیدا ہو جاتے ہیں کہ جب ہوش آتا ہے، تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے ہم پیدا ہی گناہ کے لیے ہوئے تھے لیکن یہ ہوش از خود نہیں آتا۔ دلایا جاتا ہے۔ تربیت کے ذریعہ اخلاق کے ذریعہ، مذہب کے ذریعہ اور قانون کے ذریعہ۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ان ذرائع کے باوجود ہوش آ ہی جائے۔ بعض اوقات بلکہ بیشتر گناہ و عدم گناہ کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں رہتی، انسان عمر بھر جرم کیے جاتا ہے اور یہ سمجھتا رہتا ہے ——— جو گناہ کہ وہ ثواب ہے آج، اور یوں گناہ و ثواب میں کوئی امتیاز ہی نہیں رہتا۔

حفیظ حبِ لبنیٰ کی ایک صبح، اپنی گندی سی کوٹھڑی میں جاگا تو کچھ اسی قسم کے تاثرات سے مغلوب تھا۔ جب اس نے اپنی جھلنگا سی چارپائی پر کروٹ لی تو معلوم ہوا کہ نیچے کچھ چبھ رہا ہے۔ جھک کر دیکھا تو اس چارپائی پر سے اس کا بدن زمین پر ٹکا ہوا تھا۔ وہ اُٹھ بیٹھا اور اِس طرح اُٹھ بیٹھا جیسے کسی نے اس کے ہاتھ پیر باندھ کر اور گیند بنا کر زمین پر ڈال دیا ہو۔ زمین تک لگی ہوئی چارپائی میں سے نکلنا آسان کام نہ تھا۔ اس نے ایک پٹی پر زور

دیا۔ جب وہ چرچرا کر ٹوٹنے کی دھمکی دینے لگی تو اس نے دونوں اپنے مضبوط ہاتھ زمین پر ٹیک دئے اور اس طرح چھلانگ مار کر چارپائی میں سے نکلا جیسے جانور اپنے تنگ بھٹ میں سے نکلتا ہے۔

بھوک کی وجہ سے آدھی رات تک اسے نیند نہ آسکی تھی۔ صبح ہوتے ہی ذرا آنکھ لگی تھی کہ زمین کے چبھنے سے کھل گئی۔ اس نے پڑا رہنا چاہا۔ جب آرام کی بجائے اور تکلیف ہونے لگی تو وہ اپنی چارپائی میں سے نکل آیا۔ میلی سی پھٹی ہوئی دری کو ناہموار فرش پر بچھا دیا اور داڑھی گھوٹنے کی تیاری کرنے لگا۔

کاہی جمی ہوئی پرانی صراحی جو سوکھ کر پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئی تھی ایک طاق میں دھری تھی۔ اس کوٹھڑی میں صرف ایک ہی طاق تھا جس میں صراحی بھی رکھی ہوئی تھی، ٹوٹا ہوا شیشہ بھی، کپڑے دھونے کا صابن بھی، سیفٹی ریزر بھی۔ برش تو اس کے پاس نہ تھا۔ اور وہاں ایک چھوٹا سا کنگھا بھی تھا جس کے دانتے آدھے سے زیادہ ٹوٹ چکے تھے۔

حفیظ نے شیشے کے اس جزو کو اٹھایا جس کی پشت پر سے پارہ چھٹ جانے کی وجہ سے نظر پار ہو جاتی تھی اور اپنا چہرہ دیکھا۔ چہرہ ذرا دیر میں نظر تو

آیا۔ البتہ نگاہ شیشے کے اُس پار ہو کر اُس طرف رکھی ہوئی چیزیں دیکھ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا حفیظ کی تمام ہستی اس شیشے کی طرح شفاف ہو گئی اور وہ جب اپنے کو دیکھنا چاہتا تھا تو اپنے عکس کے بجائے اپنی ہی جیسی دوسری ناکارہ چیزوں کو دیکھنے لگتا تھا۔

اُس نے صراحی کو نیچے اتار کر شیشے کو اس سے لگا کر کھڑا کر دیا تاکہ نگاہ اس کے پار نہ جا سکے۔ اُس نے شیشے کی پشت پر ایک کاغذ لگا دیا۔ اس وقتی حجاب سے شیشے کے اُس طرف کی چیزیں نظر آنے سے رک تو گئیں مگر اب ہر طرف سے کاغذ نظر آنے لگا۔ شیشہ عکس کہاں سے پیدا کرتا اس کا پارہ جھڑ چکا تھا۔ حالات نے حفیظ کی روح کو ننگا کر دیا تھا۔ اس میں صرف اتنا ہی ادراک کا مادہ رہ گیا تھا جتنا شیشے کی پشت پر بچا ہوا پارہ۔

حفیظ نے جلدی جلدی چہرے کو پانی سے چپڑا۔ منہ پر کپڑے دھونے کا صابن ملا اور بلیڈ کو ہتھیلی پر رگڑ کر داڑھی مونڈنے لگا۔ بلیڈ کند تھا۔ لہذا کیسے داڑھی بناتا۔ اس لئے اس کو پھر نکال کر اچھی طرح ہتھیلی پر تیز کرنے کے لئے رگڑنے لگا۔ کانچ کا گلاس ہوتا تو اس پر آسانی سے تیز ہو سکتا تھا مگر جب ایک شیشہ کا یہ عالم تھا

کہ عکس دینے سے قاصر تھا تو یہاں کا دوسرا شیشہ کس طرح اپنا فرض ادا کر سکتا تھا۔ ایک خود ساختہ اصول جب زندگی بگاڑ چکتا ہے تو تو کس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ اُسی دماغ کا وضع کردہ دُوسرا اصول زندگی بنانے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ مگر پھر بھی اصول بنے جا رہے ہیں، زندگیاں بگڑی جا رہی ہیں۔ یہ ماحول کے اثرات ہیں۔ ہم پروردۂ ماحول ہیں۔ اگر اس ماحول کا سبھی اپنے کو خوگر بنا لیں تو زندگی میں کوئی گرانی نہ رہے۔

لیکن حفیظ اپنے گرد و پیش کے نظام کو اپنے لئے خوگر بنانے میں کامیاب نہ ہوا ——— انسان ماحول کا خوگر نہیں ہوتا ہے۔ اگر یہ چاند، سورج زمین وغیرہ انسان کی ہستی کے موافق بھی ہوتے تو وہ اپنے موافق قسم کے چاند، سورج، زمین، شاید خود پیدا کر لیتا۔ کیونکہ اس کی فطرت میں انقلاب رچا ہوا ہے۔ اس نے سماج کو جنم دیا، یہی مذہب اور سیاست کا خالق ہے، اُسی نے پھر ان قدروں کا حلیہ تک بگاڑ دیا۔ اس سلسلہ میں انسان سے کس قدر جرم و گناہ، نیکی اور ثواب صادر ہوئے اس کا فیصلہ کبھی نہیں ہو سکے گا کیونکہ یہ سلسلہ تو ازل

سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ حفیظ نے رواں منجدھار میں اپنے کو پڑا پایا۔ منجدھار میں زور تو بہت تھا۔ کیونکہ اکثریت میں ہمیشہ زور ہوتا ہے۔ ہو سکے تو سیاست کو توڑ کر اکثریت کو بھی ختم کر دینا چاہیئے تاکہ نہ کوئی کثیر رہے نہ کوئی قلیل۔ پھر کیا ہو؟ سب حفیظ ہوں۔ اگر سب حفیظ نہ ہوں تو وہ ہوں جن کو دیکھ کر حفیظ کڑھے نہیں اور اپنے پس منظر کو بھول تو جائے۔

جب پے بہ پے ریزر کو رگڑنے کے باوجود حفیظ اس کو تیز نہ کر سکا تو غصہ میں اُس نے زور سے اس کو اپنے کلّے پر کھینچ لیا۔ ریزر کا کچھ نہ بگڑا اس نے اپنا ہی کلہ کاٹ لیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ریزر کا کچھ نہ بگڑا ہو۔ وہ ضرور بقدر ۱/۱۰۰ حصّہ اور کند ہو گیا ہو گا۔ آخر انسان کا خون اس پر لگا تھا۔ اور خون ہوتا ہے سُرخ، گاڑھا، بدبودار۔

ہر شخص اپنی خلافِ خواہش چٹان کو سر کرنے کے لئے سر پھوڑنے لگے تو اس دنیا کا کیا عالم ہو۔ اِس کا جواب حفیظ ہے۔ بہر نوع اِس وقت اس نے اِس طرح داڑھی گھوٹی کہ کہیں سے بال صفا اور کہیں کالی کالی چیونٹیوں کی طرح بے ترتیبی سے چمٹے ہوئے بال۔ اس کے بعد اس نے کچھ کھانا چاہا

مگر کھاتا کیا اور کہاں سے۔ وہ دراصل اپنی کوٹھڑی سے نکلنے ہی سے گھبراتا تھا۔ بالکل ملا ہوا کوٹھڑی سے مالک مکان رہتا تھا جس کا چوکیدار اپنے مالک کے حکم سے رات دن آتے جاتے اس کو کرایہ کے لئے ٹوکتا رہتا تھا۔

آخر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کوٹ کو دیکھا، کھونٹی سے اتار کر اس کو پہنا اور اس طرح اپنی کوٹھڑی سے نکلا جیسے کہیں چوری کرنے جا رہا ہے یا کسی کو قتل کرنے۔

(۲)

جب حفیظ مکان سے نکلا تو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، کہاں جائے۔ اسے پیسوں کی سخت ضرورت تھی۔ دو وقت سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس کا کڑیل جسم بھوک سے گرا جا رہا تھا۔ تعلیم کس قدر مہنگی ہے آج کل، ایک غریب طالب علم کو بھی پڑھائی کے لئے وہ تمام اسباب مہیا کرنے پڑتے ہیں جو صاحب استطاعت طالب علم کا حصہ ہیں۔

حفیظ بمبئی میں تعلیم کے سلسلہ میں پڑا ہوا تھا۔ کچھ عرصہ تک تو وہ گھر سے خرچ منگوا کر کام چلاتا رہا۔ اوّل تو اس کا گھر ہی خود کب متمول تھا۔ ایک بیوہ ماں تھی، ایک جوان بہن تھی اور ایک دہلی میں مکان تھا جس کے اوپر کے

حصّہ میں یہ دونوں ماں بیٹی رہتی تھیں اور نیچے کا حصّہ کرایہ پر دے رکھا تھا۔ یہ تھا حفیظ کا کل موروثی اثاثہ۔ جس کی آمدنی پر بسر اوقات ہو رہی تھی۔ مکان کی آمدنی کا کچھ حصّہ حفیظ کے پاس بمبئی بھیج دیا جاتا تھا۔ بچے ہوئے حصّہ سے وہ اپنا کام چلا رہی تھیں۔ ماں اور بہن کی پریشانیوں کا حفیظ کو اچھی طرح احساس تھا۔ اسی لیے اس نے اپنی والدہ کو لکھ دیا تھا کہ بمبئی میں اس کو کچھ پڑھائیاں مل گئی ہیں جن سے وہ اپنا کام چلا لیتا ہے۔ اب روپیہ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

چند ماہ تک یہ پڑھائیاں چلتی رہیں۔ پھر ختم ہو گئیں۔ یہی وجہ تھی کہ ایک مہینے سے وہ سخت مصیبت میں مبتلا تھا اور چند روز سے تو پیسہ پاس نہ ہونے کی وجہ سے وہ اِکّے دکّے فاقے کر رہا تھا۔ اوّل تو بمبئی کا تجارتی ماحول دوست نما الفاظ سے بھی بالکل خالی ہے اور اگر وہاں دوستیاں ہوتی بھی ہیں تو وہ بطبیعۂ ضرورت یا بخیالِ تفریح ہوتی ہیں حفیظ کو تفریح کی تو کہاں توفیق تھی ہاں وہ احتیاج اور ضرورت میں جکڑا ہوا تھا جس سے نجات پانے کی صرف ایک سبیل تھی کہ کسی کو احمق بنا کر روپیہ اینٹھے۔

وہ اس کا تو قائل نہ تھا کہ اس طرح اینٹھا ہوا روپیہ ناجائز ہے مگر ساتھ ہی اس کا دل گواہی دیتا کہ ایسا کرنا جرم بھی تو ہے۔ کسی شے کو

جُرم سمجھ لینے کے بعد وہ خود بخود بُری ہو جاتی ہے لیکن حفیظ اب تک جُرم کی حقیقت کو نہ سمجھ سکا تھا۔ وہ ایک حسّاس نوجوان تھا اور اپنی زندگی کے بہاؤ میں صرف اپنے ہی احساسات کی رہنمائی میں بہنا چاہتا تھا وہ ایک بچّہ تھا جو بغیر کسی کی انگلی پکڑے آپ اپنے پاؤں چل رہا تھا کیا ایسے بچّے اپنے پاؤں چل سکتے ہیں؟ بہت سے چل بھی رہے ہیں۔ یہ نظاموں کی ادھیڑ بُن پر فضا کی ابتری ایسے ہی تو بن سہارے چلنے والے پاؤں کی یادگار ہے۔

حفیظ نے وقت دیکھنے کے لئے جیب سے گھڑی نکالی۔ پُرانی طرز کی ایک چاندی کی جیب گھڑی جس کو وہ اپنے والد کی یادگار کے طور پر احتیاط سے لئے پھرتا تھا۔ گھڑی کے ڈائل کے ہندسے پُرانے پن کی وجہ سے دھندلے پڑ چکے تھے اور چاندی کے کیس پر جو نقش و نگار تھے۔ وہ بھی گھس گئے تھے۔

معلوم نہیں اس کو بے خیالی میں وقت نظر آیا یا نہیں۔ وہ ہتھیلی پر گھڑی کو رکھ کر اس کو تول رہا تھا۔ اس کی نظریں سامنے والی پان شاپ (رہن کی دُکان) پر پڑ رہی تھیں۔ نامعلوم کیوں خود بخود اس کی انگلیاں گھڑی پر بھینچ گئیں اور ایسا محسوس ہُوا جیسے اس کے باپ نے اس کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا ہے۔ اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا، خالی معدے سے ایک

فراقرسی بلند ہوئی اور پھر گھڑی پر سے اس کی انگلیاں ڈھیلی پڑ گئیں۔

وقت نے کب کسی کا ساتھ دیا ہے۔ جب یہ گھڑی ابا نے خریدی ہو گی یا چرائی ہو گی تو ان کا وقت اچھا ہو گا۔ اسی اچھے وقت کی یادگار کو میں اپنے بُرے وقت پر کام میں لانا چاہتا ہوں تو ابا کیوں میرا ہاتھ پکڑتے ہیں۔ میں وقت بتانے والی چیز ہی کو اپنے پاس سے ختم کر دینا چاہتا ہوں تاکہ عمر کی آنیوالی گھڑیوں میں یہ بات یاد ہی نہ رکھ سکوں کہ کوئی گھڑی اچھی گذری تھی، کوئی بری، حفیظ سوچ رہا تھا۔ یہاں تک کہ پان شاپ قریب آ گئی اور وہ اندر داخل ہو گیا

دو ماہ کے قلیل عرصہ میں حفیظ اس پان شاپ میں کئی بار آ چکا تھا اور اپنے گردش میں ہوئی کڑی گھڑیوں کو نرم کرنے کے لئے وہ یہاں بارہا چھوٹی موٹی چیزیں رہن رکھ چکا تھا۔ آج اس کے پاس صرف یہ چاندی کی گھڑی رہ گئی تھی جسے وہ غورِ ثانی کے بعد نہ رہن رکھنا چاہتا تھا نہ بیچنا۔

"کوئی اور آدمی بھی ہے کیا دکان کے اندر ؟" حفیظ نے چوکیدار سے پوچھا۔

"بہت سے آدمی ہیں سالے بھوکے مرتے یہاں آتے ہیں اور پیسے لیکر ہنستے ہوئے یہاں سے نکلتے ہیں۔ پھر سراب کی دکان پہ جا کے خوب سراب

اُڑاتے ہیں۔" چوکیدار نے کہا۔

"ناسمجھ وہ خوش خوش یہاں سے نہیں نکلتے بلکہ اپنی خوشی کا مذاق اُڑاتے ہیں اور پھر اس مذاق کو شراب کی گرمی سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے بارود جہاں بھک سے اڑنے والی چیز ہے وہاں وہ جلے ہوئے جسم پر لگانے سے ٹھنڈک بھی پہنچاتی ہے۔" حفیظ نے کہا۔

"کیا کہے رہتے ہو۔ بارود؟ بارود لے کے آئے ہو تم یہاں؟ دوکان اڑاؤ گے ہماری؟ بلاؤں پولیس کو" چوکیدار نے کہا۔

"پولیس کیا اس تماشے کو نہیں دیکھتی ہے کہ یہاں بیٹھا ہوا ایک ڈاکو رات دن لوگوں کو لوٹتا رہتا ہے۔ مگر کون دیکھتا ہے ان باتوں کو تمہارے سامنے بھی تو گھاس کے جنہ تنکے ڈال دئے گئے ہیں" حفیظ نے یہ کہا اور سیٹھ کی دوکان میں چلا گیا۔

کوڑیوں کے مول یہاں اچھی اچھی چیزیں رہن رکھی جا رہی تھیں۔ جو پھر کبھی چھڑائی جانے والی نہ تھیں۔ کیا کیا چیز رہن نہیں رکھی ہوئی ہے۔ زندگی تک بھی تو رہن ہی رکھی ہوئی ہے۔ جس کے عوض اوّل تو کچھ نہ ملا اور ملا بھی تو

"قیدِ حیات و بندِ غم" اس میں کہیں کہیں محبت کی کانا پھوسی بھی ہے جو ایک دبی ہوئی مسکراہٹ کی طرح ختم ہو جاتی ہے۔

یہاں بہت سے ایسے لوگ بھی نظر آرہے تھے جن کے لباس سے دھوکا ہوتا تھا کہ انہیں روپیہ کی ضرورت نہیں۔ بلاوجہ اپنی چیزوں کے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں۔ ابھی جا کر روپیہ یا تو ریس میں لگا دیں گے یا شراب میں۔ مگر روپے کا اور مصرف ہے بھی کیا۔ اس سے بھوک ہی تو رفع کی جاتی ہے۔ تنہا پیٹ کی بھوک نہیں، بلکہ جنسی بھوک۔ اور ہر عیاشی کی بھوک بھی بھوکا رہنے کی انہیں عادت نہیں اور کسی چیز کی طلب بغیر بھوک کے پیدا نہیں ہوتی۔

مگر حفیظ پہلی حس اور پہلے ہی خیال کو آخری صداقت سمجھنے کا عادی تھا۔ اس نے سیاہ و سفید کی تفریق کو درخورِ اعتنا اس لئے نہیں سمجھا کہ خیال کو آگے تک پھیلانا پڑتا ہے۔ مگر خیال آگے پھیلے بغیر نہیں رہتا۔ پان شاپ میں پہنچکر اس نے خیال کو اور بڑھایا تو گھڑی رہن رکھنے کا ارادہ ملتوی کر چکا تھا۔ اس لئے کہ سیٹھ کی آدمیت سے اپیل کر کے بغیر کچھ رہن رکھے روپیہ ادھار لینا چاہتا تھا۔

"سیٹھ صاحب" حفیظ نے دکاندار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس وقت وہ کئی آدمیوں سے سودا کر رہا تھا اور قیمتی چیزوں کو سستے داموں چکا لینے کے قریب آ گیا تھا۔ حفیظ کی مداخلت پر وہ خفا ہو گیا اور تیز آواز سے بولا "کیا ہے؟"

"آپ سے کچھ کہنا ہے۔" حفیظ نے کہا۔

"کہنا ہے تو یہیں کیوں نہیں کہتے۔ آخر یہ لوگ بھی تو عزت والے ہیں اور سب کے سامنے اپنی چیزوں کا سودا کر رہے ہیں۔" دکاندار نے کہا۔

"مجھے ان کی عزت سے بحث نہیں۔ مَیں تو علیحدگی میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" حفیظ نے کہا۔

"مجھے فرصت نہیں پھر آنا۔"

"پھر آنے کی مجھے فرصت نہیں ہو گی۔" حفیظ نے کہا۔

"تو چلے جاؤ مجھے کام کرنے دو۔" دکاندار نے اس کی طرف پشت کر لی اور دوسرے گاہکوں سے بات چیت کرنے لگا۔

حفیظ چند منٹ تک تو صبر کیے کھڑا رہا۔ اس نے دیکھا کہ دوسرے گاہک اس کی توہین پر ہنس رہے ہیں تو وہ نکل جانے کے ارادہ سے مڑا مگر بھوک نے پَیر پکڑ لیے۔ اس کا ارادہ آج چونکہ رہن رکھنے کا نہ تھا بلکہ ادھار لینا چاہتا

تھا۔ اس دکان کا وہ بہت پرانا گاہک تھا اور سیٹھ اس کو اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ کئی بار وہ حفیظ سے قیمتی چیزیں لے کر یا تو سستے داموں میں خرید چکا تھا یا ہضم کر گیا تھا۔

یہ پان شاپ والا حفیظ کے ساتھ ہمیشہ ہی بڑی بدتمیزی سے پیش آیا کرتا تھا اور حفیظ اس سے سخت نفرت کرتا تھا۔ نہ صرف اس لیئے کہ پان شاپ والا ایک اچھا شہری نہ تھا بلکہ اُس نے لُوٹ لوٹ کر بہت سے لوگوں کو تباہ کر دیا تھا جلنے کو تو اور لوگ بھی اس سے بہت جلتے تھے مگر حفیظ کو تو اس سے دلی بغض تھا۔

دکان کے اندر بھیڑ کم ہونے کے انتظار میں حفیظ باہر جا کر ٹہلنے لگا مگر وہاں کیفیت یہ تھی کہ ایک نکلتا تھا تو تین آتے تھے۔ اس کو ٹہلتے آدھا گھنٹہ ہو گیا۔ آخر وہ ایک درخت کے سایہ میں جا کھڑا ہوا۔ قریب ہی خوانچہ والا چاٹ بیچ رہا تھا۔ حفیظ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ مگر کیا کرتا۔ جیب میں ایک پیسہ نہ تھا کہ کچھ لے کر پیٹ میں ڈالتا۔ ویسے ہی ٹہلتا ٹہلتا خوانچہ والے کے پاس جا کھڑا ہوا اور اس طرح بے پروائی سے خوانچہ اور چاٹ خریدنے والوں کو دیکھنے لگا گویا صرف تماشا دیکھ رہا ہو۔

"چاٹ چاہیئے بابو"؟ خوانچہ والے نے دریافت کیا۔

"چاہیئے تو، مگر میرے پاس بھُنی ہوئی ریزگاری نہیں ہے۔" حفیظ نے کہا۔

"دس رُپے کی تو میرے پاس ہی نکل آئے گی۔"

"میرے پاس سو رُپے کا نوٹ ہے۔" حفیظ نے کہا۔

"تو سامنے سیٹھ کی دکان سے بھُنا لائیے۔ ہُن برستا ہے ان کے ہاں تو۔" خوانچے والے نے کہا۔

"کیا تم ایسا نہیں کر سکتے کہ مجھے دے دو۔ پیسے اُس وقت لے لینا جب میرا نوٹ بھُن جائے۔" حفیظ نے کہا۔

"نہیں بابو۔ ہاں یہ کرو کہ اپنا سو روپے کا نوٹ میرے پاس رہن رکھ جاؤ۔" خوانچہ والے نے کہا۔

"بہت ہوشیار آدمی معلوم ہوتے ہو۔ سو روپے کا نوٹ میں تو تمہارے پاس رکھ جاؤں مگر تم اپنے دو آنے کا اعتبار مجھ پر نہیں کر سکتے۔" حفیظ نے کہا۔

"اچھا! تمہارے پاس سو رُپے ہیں"! حفیظ کو اپنے عقب سے ایک اجنبی آواز سنائی دی۔

حفیظ نے جلدی سے گردن موڑ کر دیکھا۔ ایک بوڑھا شرابی اس کے

پیچھے کھڑا تھا۔

"تم نے ابھی کہا تھا ناکہ تمہارے پاس سو روپے کا نوٹ ہے۔ آہاہاہا۔ اگر میرے پاس ہوتا تو میں آج اُسے ضرور دے دیتا ——— وہ خوش ہو جاتی اور شاید مجھے گھر میں آ جانے دیتی ——" بوڑھے نے کہا اور لڑکھڑا کر تار کا کھمبا پکڑ لیا۔

"کس کو دے دیتے بڑے میاں؟" حفیظ نے دریافت کیا۔

"پھر بتائیں گے ——پھر—— ابھی تو ہم پان شاپ میں جا رہے ہیں۔ یہ دیکھو چاندی کا کڑا —— بتاؤ کتنے روپے ملیں گے اس کے؟ نہیں بتا سکتے؟ پانچ —— پانچ روپے۔ لا خوانچہ والے دو آنے کی چاٹ تو دے ہیں ——" بوڑھے نے کہا اور چاٹ کھانے بیٹھ گیا۔

حفیظ پھر پان شاپ میں داخل ہوا۔ اس وقت وہاں صرف دو ہی آدمی تھے جو اپنے اپنے پیسے گن رہے تھے۔

"تم پھر آ گئے؟" دکاندار نے حقارت سے حفیظ کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"ہاں سیٹھ جی۔ آج مجھے روپے کی سخت ضرورت ہے۔" حفیظ نے میز پر

ہاتھ ٹیکتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کس روز روپے کی ضرورت نہیں ہوتی؟"

"آج تو بہت ہی مجبور ہو کر آیا ہوں۔"

"تو میں کیا کروں۔ بیکار سامان دے جاتے ہو اور چھنکتے ہوتے روپے لے جاتے ہو ہمیشہ۔" سیٹھ نے کہا۔

"بیکار سامان؟ کتنے جھوٹے ہو تم سیٹھ۔ قیمتی قیمتی چیزیں میں نے آپ کو دی ہیں جن کے بدلے آپ نے مجھے چند پیسے دے کر ٹرخا دیا۔" حفیظ نے کہا۔

"اچھا دماغ نہ چاٹو۔ جاؤ تم جیسے بھک منگوں کو یہاں دیکھ کر اچھے گاہک بدک جائیں گے۔" دکاندار نے غصہ سے کہا۔

"میں بھک منگا ہوں۔ کیا بھیک مانگی ہے میں نے تم سے۔ ہمیشہ روپے کی چیز پیسے میں لی ہے تم نے مجھ سے۔ تم ڈاکو ہو چور ہو۔" حفیظ نے غصہ سے کہا اس کے بعد اس کو فوراً ہی افسوس ہوا۔ وہ آج پان شاپ والے سے پہلی بار روپیہ قرض لینے نکلا تھا۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ اس کے پاس اب رہن رکھنے کو کچھ نہ رہا تھا۔ مگر ذرا سے غصہ نے تمام معاملہ بگاڑ دیا اور

اُس نے اس وقت ادھار روپیہ مانگنے کی بجائے اپنے کو اپنے باپ کی یادگار گھڑی رہن رکھنے پر مجبور پایا۔

آخر وہ تیس روپے میں یہ قیمتی گھڑی رہن رکھ کر خورد و نوش کی دُنیا میں نکل آیا۔ آخر کیا کرتا۔

(۳)

حفیظ نے ایک ہوٹل میں جا کر ڈٹ کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد چائے پی، سگریٹ خریدا، پان کھایا اور برائے نام اپنے افلاس، پریشانیوں اور آلام کو بھول کر باغ میں بنچ پر جا لیٹا۔ اپنی تاریک اور گندی کوٹھڑی میں جا کر کیا کرتا۔ وہ چاہتا تھا کہ جتنا وقت اس کوٹھڑی کے باہر گذرے اچھا ہے۔ یوں تو بھی اسی قسم کی ایک تاریک کوٹھڑی ہے اور حفیظ جیسا ہر انسان اس کی تاریکیوں کی قدر جانتا ہے۔

حفیظ بہت دیر تک وہاں لیٹا رہا، کبھی اس کو گھر کا خیال آتا۔ کبھی اپنی ماں اور بہن یاد آتیں۔ نامعلوم کیا حال ہو گا ان کا۔ دو ماہ سے نہ تو اس نے

کوئی خط بھیجا اور نہ ہی اُن کا آیا۔ ایسی تعلیم سے کیا فائدہ جس کا حال اس قدر مصیبتوں سے پٹا پڑا ہو اور مستقبل اس سے بھی زیادہ گھناؤنا ہو۔

دفعتہً حفیظ نے اپنے سرہانے بڑھاپے کی ایک طویل اور دم اکھاڑ کھانسی کی آواز سُنی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو وہی بوڑھا شرابی قریب کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی ایک بوتل تھی۔ بڑھاپے اور کثرتِ شراب نوشی سے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا اور زندگی کی بے اعتدالی اس کے بشرے پر ایسا گہرا نقش چھوڑ گئی تھی کہ وہ اس دنیا کی پستی کا مقتدر نمائندہ نظر آتا تھا۔

"آہا تم ہو۔" بوڑھے نے کھانسی کا دورہ ختم ہو جانے کے بعد حفیظ کو پہچان کر کہا "سو روپے ہیں تمہارے پاس؟ لاؤ ان کو اس بوتل میں گھول دو۔"

"بیٹھو بڑے میاں۔ ارے پھر پی آئے۔ چاٹ والے کے پاس کھڑے تھے تو وہاں بھی بُری طرح پیے ہوئے تھے۔ آخر تم اپنی ناتواں اور بچی کھچی زندگی کے دشمن کیوں بنے ہوئے ہو۔" حفیظ نے کہا۔

"دشمن؟ میں تو کسی کا دشمن نہیں۔ وہی مجھے اپنا دشمن سمجھنے لگی ہے — ٹھیک سمجھتی ہے — میں کام ہی ایسے کرتا ہوں۔ وہ ٹھیک سمجھتی ہے مجھے اپنا دشمن —"

"وہ کون ہے؟ تم نے چاٹ والے کے پاس بھی اس کا ذکر کیا تھا۔ وہ کون عورت ہے جس سے تم نالاں ہو؟"

"کون عورت ہے؟ — ارے وہ عورت ہے — وہ میری بیوی ہے اور کون ہے — بیوی ہے میری۔ بوڑھی نہیں ہے وہ۔ تیس پینتیس سال کی ہوگی اس کی عمر۔ دوسری بیوی ہے میری۔ بڑی گھردار، سگھڑ اور اچھی۔ میں ہی بُرا ہوں، بہت بُرا۔ گھر میں پڑا پڑا مزے کرتا رہا اور شراب پیتا رہا۔ اُس نے کہا شراب نہ پیا کرو۔ میرے کان پکڑے، بال نوچے اور کہا شراب مت پیا کرو۔ کماتے تو کچھ ہو نہیں۔ میں وعدہ کرتا، اچھا نہیں پئیں گے اور خوب کمائیں گے۔ مگر کوئی کمائی نہیں ملی۔ لوگ کہنے لگے تم بوڑھے ہو، نہیں رکھتے تمہیں نوکر۔ ہم نے کہا اچھا مت رکھو۔ بیوی نے کہا فاقے ہو رہے ہیں کچھ لاؤ کما کر۔ ہم نے کہا ہم کہاں سے لائیں۔ اُس نے بُرا بھلا کہا۔ ہم چپ سادھ گئے۔ ہر روز سوتے رہے اور دن بھر میں دو روٹیاں بغیر ہاتھ پیر ہلائے ملتی رہیں۔

ایک دو ہفتے کے بعد میں نے دیکھا کہ دونوں وقت کھانا ملنے لگا ہے اور وہ بھی اچھا کھانا۔ واہ کتنی سگھڑ ہے میری بیوی۔ کوئی انتظام کر ہی لیا آخر۔ پر میں نے دیکھا کہ میری بڑی لڑکی کا رنگ روز بروز زرد ہوتا جا رہا ہے، مگر وہ کپڑے

بڑے اچھے پہنے ہوئے رہتی۔ اس کے چہرے پر سُرخی اور پاؤڈر لگا ہوا دیکھتا جس سے وہ مجھے اور بھی پیاری نظر آتی۔ میری بیوی کتنے آرام سے رکھتی ہے اپنی بچی کو لوگ یونہی کہتے ہیں کہ سوتیلی ماں، ماں نہیں ہوتی،

مَیں نے ایک دن اپنی لڑکی سے پوچھا کہ بیٹی تُو بیمار ہے؟ تیری ماں تو تجھے بالکل اپنی ہی اولاد کی طرح چاہتی ہے۔ پھر آخر تجھی بجھی کیوں ہو۔ بس یہ پوچھنا غضب ہو گیا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔ کاجل بہنے لگا۔ مَیں نے اُسے پیار کیا۔ یونہی بے فائدہ رو دی مجھے دیکھ کر۔ پاگل کہیں کی۔

جب وہ چلی گئی تو مَیں نے گنجینہ میں رکھی ہوئی مٹھائی چپکے سے نکالی۔ گنجینے میں پانچ رُوپے کا ایک نوٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ بیوی سگھڑ تھی۔ مگر گھر کے دھندوں میں بھول گئی نوٹ وہاں۔ مَیں نے اُٹھا لیا اور بازار جا کر بوتل خریدی۔ پی اور آ کر رات کو سو گیا۔ جب میں گھر میں آیا تو میری نیک اور محبّت کرنے والی بیوی میری لڑکی سے تیز آواز میں کہہ رہی تھی "نئی ساڑی بدل کر جا اوپر اور اچھی طرح پاؤڈر سرخی لگا لے"۔ جی خوش ہو گیا میرا۔ کتنا خیال رکھتی ہے وہ اپنی سوتیلی اولاد کا۔ اوپر کے کمرے میں مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی مرد کی آواز آ رہی ہے

ہمارا سارا محلہ مردوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہی ہونگے۔ وہ شراب نہیں پیتے۔ اس لئے زور زور سے باتیں کیا کرتے ہیں۔ بھلے آدمی ہیں سب۔ مولوی صاحب بھی بڑے اچھے آدمی ہیں۔ تم بھی شراب پیتے ہو؟ پیا کرو۔ بڑی اچھی چیز ہے۔"

حفیظ بوڑھے کی باتوں سے اکتا گیا۔ کتنا عجیب و غریب اِنسان ہے یہ کہ اپنی بیوی کی تعریف کیے جا رہا ہے۔ حالانکہ اس نے اپنی سوتیلی لڑکی کو دوسرے ڈھنگ پر لگا دیا ہے تاکہ اس کے معصوم شباب کو گندے آغوشوں میں فروخت کر کے معاشی ضروریات کو پورا کرے۔ اس کی کمائی سے پیٹ پالا جا رہا ہے، گھر کے کام نکالے جا رہے ہیں، ایک بگینا لڑکی کو سستے داموں میں بیچکر وہ عورت اپنے بوڑھے شوہر سے اس کی بیکاری اور نکمے پن کا انتقام لے رہی ہے اور یہ احمق اِنسان اس کو سگھڑ، نیک نفس اور گھر یلو سمجھ رہا ہے ہندوستان میں کتنے معاش اسی طرح پیدا کیے جا رہے ہیں اور نہ جانے کتنے پیٹ پل رہے ہیں۔ بیشک ہمارے وطن میں بہت سے گھرانوں کے اندر یہ کھیل صرف منرورتاً ہی نہیں بلکہ محض بسلسلۂ تفریح اور بخیال فیشن بھی یہ چیزیں رائج ہیں۔ کچھ والدین آزاد خیال ہیں کچھ مجبور ہیں۔ یہاں سب کچھ روا ہے مباح ہے۔ ہندو اور مسلمانوں کی باہمی چپقلش کے اثرات ہیں۔

جس کے نتیجے میں ہندوستان کی کثیر آبادی روزگار کی تنگی کی وجہ سے اِس ذلیل تجارت میں مبتلا ہو کر آزادی کے گُن گا رہی ہے۔

"کیا عمر ہو گی تمہاری لڑکی کی ؟" آخر حفیظ نے دریافت کیا۔

"اچھا پٹھے۔ اب عمر بھی پوچھنے لگے، جانہیں بتاتا" بوڑھے نے بوتل سے منہ لگا کر کہا، پھر ایک دو گھونٹ اتارنے کے بعد بولا۔

"عمر پوچھی ہے تم نے ؟ — یہی ہو گی سترہ اٹھارہ برس کی۔ ارے ایکدم جوان ہو گئی۔ تھوڑے دن پہلے چھوٹی سی تھی وہ —"

"بڑے میاں شرم نہیں آتی کہ اس طرح گھر سے پیسے چرا کر شراب میں اُڑاتے ہو۔ اور تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ پیسے کہاں سے آتے ہیں۔" حفیظ نے کہا تو بوڑھے میاں نے قہقہہ لگانا چاہا مگر کھانسی نے روک دیا۔

"پیسے! پیسے وہیں سے آتے ہیں جہاں سے سب کے آتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"سب لوگوں کے پیسے علیحدہ علیحدہ جگہ سے آتے ہیں بڑے میاں۔ بعض لوگ چوری کرتے ہیں، بعض ڈاکہ ڈالتے ہیں، بعض جگہ پیسہ حرام کے

ذریعہ کمایا جاتا ہے اور کچھ آدمی صحیح طریقے سے کسبِ معاش کرتے ہیں۔ تم بالکل بیکار رہو۔ تم نے کبھی یہ سوچا کہ تمہاری ناداری کی حالت میں یکایک گھر میں پیسہ کیسے آنے لگا؟"

"واہ میں کیوں سوچتا۔ میری بیوی بہت سگھڑ ہے۔ اسی نے کیا ہوگا کوئی بندوبست۔" بوڑھے نے نشہ میں بنچ پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو" اس شرابی سے گفتگو کرنا بیکار تھا۔ چند منٹ بعد حفیظ نے کہا

"تم نے پان شاپ میں اب کے کیا رہن رکھا ہے؟"

"میں نے"؛ بوڑھے نے سر اٹھا کر اسی بہکے ہوئے انداز میں کہا۔ "اب کے میں نے چاندی کے کڑے رکھے ہیں۔ بڑا ہی پاجی ہے سیٹھ۔ پیسے بہت کم دیتا ہے۔ میرا بس نہیں چلتا کہ اس کو مار کر دکان لوٹ لوں۔"

حفیظ پہلے ہی سیٹھ پر غار کھائے بیٹھا تھا۔ ہر چند بوڑھے کی باتیں اور اس کی حالت سخت قابلِ نفرت تھی۔ مگر پان شاپ والے سے نفرت کرنے اور اس کی جان لینے کے سلسلے میں وہ بھی حفیظ کا ہمنوا نکلا۔ اس سے حفیظ کو تسکین ہوئی۔

"اچھا بڑے میاں۔ پھر کبھی ملنا۔ مجھے تم سے اور بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ لیکن پی کر نہ آنا۔ ذرا ہوش و حواس کے ساتھ آنا"

حفیظ نے یہ کہا اور چل دیا۔ پہلے وہ اپنی ہی ناداری پر روتا تھا۔ اب تو بڈھے کی بیکاری اور اس کی بچّی جو دن بدن زرد ہوتی جا رہی تھی۔ اور اس کی بیوی، جو سوتیلی ماں ہونے کے باوجود اس کی بچّی سے بے اندازہ محبّت رکھتی تھی —— ان سبھی باتوں نے مل ملا کر اسے اور بھی پریشان کر دیا۔

(۴)

حفیظ نہ صرف مذہب سے بلکہ زندگی کے جو چند اچھے اصول مقرر ہیں ان سے بھی نابلد تھا۔ لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ اگر چند اصولوں پہ کچھ لوگوں کا اجماع ہو تو وہ ہر شخص کیلئے قابلِ قبول ہیں۔ ایک خونخوار ڈاکو دن بھر پلنگ پر پڑے رہنے اور ساگ پات کھانے میں راحت محسوس نہیں کر سکتا۔ اس کی آسائش اسی میں ہے کہ وہ صحرا بصحرا ابھرتا رہے۔ لوٹے، گلے کاٹے اور خطرات سے بھری ہوئی زندگی گزارے۔ اُسے کیسے پُرامن زندگی گزارنے کے لئے مجبور کیا جا سکتا ہے۔

مگر ایسے ہی سفاک ڈاکوؤں کو دیکھا گیا ہے کہ بستیوں میں لوگوں کو لوٹ ما

کہ عورتوں کی عزت اتار کر جنگل میں چلے آتے ہیں۔ وہاں ان کو کوئی دودھ بیچنے والی یا کوئی مالن مل گئی تو انہوں نے نہ تو اس کا گہنا اتارا اور نہ اس کی عزت لوٹی۔ بلکہ روپے سے اس کی مدد کر کے بحفاظت اس کو بستی میں پہنچا دیا۔

یہ کیا حس ہے؟ یہ کونسا اخلاقی یا مذہبی قانون ہے۔ جو ان سفاکوں سے صادر ہوا۔ یہ کوئی ضابطہ یا قانون ہو یا نہ ہو مگر انسانیت کی ایک رمق ضرور ہے بس مذہب اور پاکیزہ اصول انسانوں میں اسی رمق کو جھنجھوڑ کر اپیل کرتے ہیں۔

حفیظ کا افلاس' اس کے فاقے اور فاقوں میں کبھی کبھی پیسے ہاتھ لگ جانا اور ان پیسوں سے کبھی پیٹ کی۔ کبھی نفس کی بہیمیت مٹانا اس کی عام عادت تھی۔ اس طوفانِ بدتمیزی میں اسے اندھا بوڑھا شرابی مل گیا۔ جس کی ابھی ابھی جوانی کے خارزار میں قدم رکھنے والی معصوم لڑکی اور اس کی سوتیلی ماں جو ضروریاتِ زندگی کی وجہ سے لڑھک گئی تھی۔ وہ حفیظ کو بھی چند راتوں کی دعوت دے رہی تھی۔ ابھی اس کے پاس تیس روپے تھے اور وہ جسمانی تجارت جو صرف روزگار کی خاطر اختیار کی جائے جلد ترقی نہیں کرتی۔ اس لئے حفیظ یہ اندازہ لگانے میں حق بجانب تھا کہ بوڑھے کی

لڑکی کی فیس بھی دو چار روپے سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اس کو وہ منڈیاں بھی معلوم تھیں۔ جہاں معاش کی خاطر اپنے جسم کے سودے صرف ایک ایک روپیہ میں ہو رہے تھے۔

پہلے خیال کی تحریک نے حفیظ کو بھی اپنی مضمحل جوانی کی کسل چھوٹی سی قیمت ادا کر کے، بوڑھے کے ہاں کی پوشیدہ اور کچی دکان میں اتارنے کا ارادہ کیا۔ شاید وہ اپنے اس ارادے میں مستقلاً قائم رہتا۔ لیکن جب اس نے اپنے سے بھی زیادہ دو بُرے کردار دیکھے تو بوڑھے کے اندھے پن پر جھلّا کر اور اس کی بیوی کے پھوہڑاپے کو عریاں کرنے کے جذبہ سے مغلوب ہو کر آہستہ آہستہ اس کا خیال سمت بدلنے لگا۔ چند منٹ بعد اس کے فیصلہ کی آخری سمت یہ تھی کہ وہ اس لڑکی کی پوری فیس سے ذرا زیادہ ادا کر کے مستقلاً وہاں کا گاہک بن جائیگا تاکہ کوئی دوسرا نہ آسکے اور وہ بدکرداروں میں گھری ہوئی وہ بے اختیار لڑکی جس حد تک اب تک بگڑ چکی ہے اس سے آگے نہ بگاڑی جاسکے حفیظ سے پوری فیس پا کر بھی نہ بگاڑی جائے۔ وہ اس کے پاس راتیں گزارے گا مگر خریدار کی طرح نہیں بلکہ محافظ کی طرح۔ اس لڑکی کے دو ذمہ دار محافظ اس کی جانب سے غافل ہو گئے تھے۔ تیسرا غفلت نہیں برتے گا۔

سفاک ڈاکو کو جنگل میں ایک عورت مل گئی تھی جسے وہ لوٹ نہیں رہا تھا۔ بلکہ معاش کے لئے پیسے دے کر جہاں تک بحفاظت پہنچانا ناممکن تھا۔ وہاں تک وہ زندگی کی بستی میں اسے بحفاظت پہنچائے گا۔

مگر پیسے؟ اس بے زر ڈاکو کے پاس تو پیسے بھی نہ تھے۔ لنگڑا شیر کیسے بکری کی حفاظت کرے گا۔ ایک بدکار انسان کی فطرت سے ٹپکا ہؤا یہ کارِ نیک بغیر پیسے کے کیسے نبھ سکے گا۔ حفیظ تو خود پیسے پیسے کو محتاج تھا۔ ایک ایک کرکے سب چیزیں رہن رکھ چکا تھا۔ کہاں سے وہ لوبڑھے کی لڑکی کی حفاظت کے لئے روزانہ فیس ادا کرے گا اور کہاں سے اپنا پیٹ بھرے گا۔ جس روز بھی اس نے فیس ناغہ کردی اسی روز کسی قدر لٹے ہوئے خزانہ کا حفاظتی قفل پھر ٹوٹ جائے گا۔ اور یوں چند ہی روز میں پھر خزانے کی عمارت کھنڈر میں تبدیل ہو جائے گی۔

خیر ابھی حفیظ کے پاس پیسے موجود تھے۔ پہلی رات ہی کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کتنی راتوں کی فیسوں کی کفالت کر سکتے ہیں۔

دوسرے روز شام کو وہ پھر پان شاپ کی طرف سے گزرا اور سیٹھ کے خلاف معاً اس کے سینے میں نفرت کا جذبہ بھڑک اُٹھا۔ یہ کمبخت تنہا

اتنی دولت لئے اپنی ایک بھٹیچر سی بیوی کے ساتھ کیوں زندہ ہے۔ اس کی دولت میں کسبیوں، شرابیوں، چوروں کا بھی حصّہ ہے۔ کیوں نہیں وہ ان کا حصّہ ان کو دیتا۔ تاکہ وہ دل بھر کر یا تو گناہ کر کے مر جائیں یا گناہ سے سیر ہو کر ایک اچھے شہری کی حیثیت سے زندہ رہیں۔

اس نے حقارت و غصّہ سے دکان پر نظر ڈالی اور باغ کی طرف چل دیا۔ بنچ پر وہی بڈھا پڑا ہوا کھانس رہا تھا۔ شراب کی خالی بوتل نیچے پڑی ہوئی تھی جس کو وہ کبھی کبھی حسرت سے دیکھ لیتا تھا۔

"دیکھو آج میں ہوش میں ہوں۔ بہت ہی تھوڑی پی ہے۔" اس نے حفیظ کو دیکھتے ہی کہا۔

"لیکن یہ خالی بوتل بتا رہی ہے کہ تم نے آج کل سے زیادہ پی ہے۔" حفیظ نے پیر سے بوتل کو ٹھکراتے ہوئے کہا۔

"پی تو ہے ہم نے۔ ہاں پی ہے جھوٹ کیوں بولیں۔" بوڑھے نے نشہ میں بکنا شروع کیا۔

"آج تمہیں پیسے کہاں سے مل گئے؟" حفیظ نے دریافت کیا۔

"پیسے؟ آج پھر تھوڑے سے پیسے چرائے ہیں ہم نے دو روپے۔

بس دو روپے کی پی ہے۔ زیادہ نہیں۔"

"اچھا کھانا کھالیا تم نے"؟ حفیظ نے پوچھا۔

"کھانا —— نہیں کھایا اب تک۔ اب تو رات ہو گئی۔ گھر پر ہی کھائیں گے۔ مگر میری بیوی آج ضرور بری طرح میری مرمت کرے گی۔"

"چلو ہوٹل چلیں۔ میں کھانا کھلاؤں گا تمہیں پھر تم مجھے اپنے مکان پر لے چلنا تاکہ میں تمہاری بیوی سے سفارش کر دوں کہ تمہیں سزا نہ دے۔" حفیظ نے کہا۔

"اچھا —— بہت اچھا —— بڑے اچھے آدمی ہو تم تو یار۔ میرے دوست بن جاؤ۔ میری سگھڑ بیوی جب دیکھے گی کہ میں تم جیسے نیک آدمی کی صحبت میں رہتا ہوں تو وہ خوش ہو جائے گی۔"

"ہاں ضرور خوش ہو گی۔ تمہاری لڑکی بھی گھر پر ہی ہو گی؟" حفیظ نے پوچھا۔

"ایں۔ ہاں۔ شام کو اس کی ماں اس کے بال سنوار رہی تھی۔ کتنی محبت کرتی ہے وہ اپنی سوتیلی لڑکی سے۔ بڑی ہی نیک ہے وہ۔ میں تو بہت ہی برا آدمی ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد حفیظ اُسے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ دونوں نے کھانا کھایا۔ مگر بوڑھے کو کھانے کے بعد قے ہو گئی۔ جس سے اس کا نشہ اور بھی تیز ہو گیا۔ آخر حفیظ اس کو سنبھالتا ہوا اس کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۵)

رات کے نو بجنے والے تھے۔ حفیظ کو خوف تھا کہ دیر ہو جانے کی وجہ سے کہیں روزنہ کے یا کوئی نئے گاہک ہی بوڑھے کے یہاں نہ آ گئے ہوں۔ وہ آج رات ہی سے اس کی لڑکی کو اپنے حیلۂ عیاشی کے لئے حاصل کر لینا چاہتا تھا۔

بوڑھے کے قدم نہیں اُٹھ رہے تھے اور اس کا مکان تھا دور، اس لئے مجبوراً حفیظ کو تانگہ پکڑنا پڑا۔ اب وہ اپنے اس عجیب و غریب نیک کام کیلئے ایک ایک پائی کی حفاظت کر رہا تھا۔ چنانچہ بچت کی خاطر اُس نے صبح کھانا بھی نہیں کھایا جس کی کسر اس وقت بوڑھے کے کھانا کھانے سے نکل گئی۔

جونہی بوڑھے نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا اس کی بیوی بلا کی طرح اس پر جھپٹی اس نے حفیظ کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اُسے گھسیٹ کر صحن میں ڈال دیا اور لات مار کر بولی۔

"تجھے خدا غارت کرے موئے چوٹے۔ پار کر دیئے نہ دو روپے آج پھر میں تو پیسہ پیسہ تیری چہیتی اولاد کے بناؤ سنگار کے لئے بچاؤں کہ وہ ٹھاٹھ سے رہے اور تو یوں اس کو غارت کر دے۔ بے شرم کہیں کا۔"

"ہم تو بُرے ہیں ـــ بہت ہی بُرے بیوی۔ پر یہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ انہوں نے آج مجھے کھانا کھلایا ہے۔" بوڑھے نے پڑے پڑے کہا۔ معاً اپنے باپ کو سنبھالنے کے لئے تیزی سے ایک لڑکی بڑھی۔ حفیظ نے دیکھا کہ مصنوعی ٹیپ ٹاپ کے باوجود وہ لڑکی اب بھی جوان اور دیدہ زیب نظر آتی ہے۔ اس کی جوانی چھوئی جا چکی تھی جو جلد ہی بگڑ کر جوانی کے بجائے ایک صرف "فنی" جوانی رہ گئی تھی۔ یہ لڑکی ابھی فن کی سرحد سے قدرے دُور تھی اور اب تک عورت ہی نظر آ رہی تھی۔ حفیظ غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے باپ ہی کو اس کی عمر کا صحیح اندازہ تھا۔ جس نے اس کو سترہ یا اٹھارہ سال کی بتایا تھا۔ لیکن تھوڑی مدت سے شروع ہونے والے

جان لیوا مصرف نے ایک ماہ کے اندر اندر اس کے بشرے پر اور پانچ سال کا اضافہ کر دیا تھا۔ چھوڑے جانے کے باوجود اس کا جسم ابھی گھلا نہ تھا۔ بے قاعدہ پوڈر کے غلاف کی وجہ سے اس کے صحیح رنگ کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ لیکن گردن اور کان سے اندازہ ہوتا تھا کہ گندم گوں ہے۔ آنکھیں کاجل کی وجہ سے بڑی بڑی نظر آ رہی تھیں۔ تھیں ہی شاید بڑی۔ بحیثیت مجموعی نقشہ بُرا نہ تھا بلکہ دیدہ زیب تھا۔

وہ اپنے باپ کو اٹھا کر ایک کوٹھڑی میں لے گئی۔ حفیظ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اب بوڑھے کی بیوی نے بھی حفیظ کو دیکھا۔ پہلے متعجب ہوئی! اس کی آنکھوں کے سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ جس کے لباس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ فلاکت کو چھپا رہا ہے۔

”تم کون ہو؟“ عورت نے آہستہ سے حفیظ سے دریافت کیا۔

”مجھے تم ایک کام کا آدمی ہی پاؤ گی۔“ حفیظ نے مسکرا کر کہا۔

”تم بھوری کے ابا کو کہاں سے جانتے ہو؟“ عورت نے پھر دریافت کیا۔

”بھوری کون؟“ حفیظ نے کہا۔

"یہی لڑکی جو ابھی اپنے شرابی اور چوہر باوا کو اٹھا کر لے گئی ہے۔"
عورت نے کہا۔

"اچھا اس کا نام بھوری ہے؟ بڑا خراب نام ہے اس کا۔"

"تم رکھ دو نا کوئی اچھا سا نام۔ پیسے ہیں جیب میں؟" عورت نے حقارت سے پوچھا۔

"بہت پیسے۔ مگر پیسوں سے نام کیسے بدلا جا سکتا ہے۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔" حفیظ نے چند راتے ہوئے کہا۔

"تم جب بالکل ولی اللہ ہی تھے تو یہاں کیا لینے آئے۔" اس کے چہرے پر غصّہ کے آثار نہ تھے۔ بلکہ تاسّف سا پایا جا رہا تھا۔ جیسے کسی گاہک کے اب تک نہ آنے کا افسوس کر کے اس شخص کو بھی گاہک نہ پا کر رنج کر رہی ہو۔

ٹھٹھک کر حفیظ نے رکتے اور ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ لڑکی تمہاری تو معلوم نہیں ہوتی ہے کیونکہ تمہارا ناک نقشہ تو بہت اچھا ہے اور یہ لڑکی بھدّی سی ہے۔"

وہ عورت اپنی تعریف سُن کر خوش تو بہت ہوئی مگر اسے اس کا

بھی افسوس ہوا کہ اس نے اس کی کمائی کے ٹھیکرے کو پسند نہیں کیا۔ بلا وجہ اس وقت کمائی کی خاطر اسے لڑکی کی حمایت کرنی پڑی۔ آخر بولی: "نہیں وہ ایسی بری تو نہیں ہے۔ کچھ پیسے کما ہی لیتی ہے۔"

"کما لیتی ہے! کس طرح؟ حفیظ نے حکمتِ عملی برتتے ہوئے پوچھا تو عورت ہنس دی۔

"تم بھی بالکل کودن ہی معلوم ہوتے ہو۔ اب کیا مجھ سے صاف صاف کہلواؤ گے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھلاتی ہوئی ذرا آگے بڑھ آئی کیونکہ حفیظ نے اس کی شکل و صورت کی تعریف کرنے کی غلطی کی تھی۔ جو شخص گناہ کے سہارے اپنے کام نکال رہا ہو وہ لطفِ گناہ لینا پسند کیوں نہ کرے گا۔

حفیظ ڈر گیا۔ خدا خیر کرے۔ میں تو آیا تھا کسی اور مقصد سے یہ عورت میرا مقصد ہی بدلے جا رہی ہے۔ چونکہ اسے اس سے بہت کام لینا تھا۔ اس لئے اُسے ناخوش نہیں کر سکتا تھا۔ پیچھے ہٹنے کے بجائے اکراہ کو ضبط کئے کھڑا رہا اور بولا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے — مگر تمہیں دیکھ لینے کے بعد اس بدصورت چھوکری کے پیسے کون لگاتا ہوگا۔"

حفیظ ایک ترکیب یہ بھی چل رہا تھا کہ جس قدر وہ لڑکی کی جانب کم رغبت کا اظہار کرے گا اتنی ہی اس کی قیمت کم ہو جائے گی۔ اگر ایک دم اس پر ٹوٹ پڑتا تو منہ مانگے دام دینے پڑتے۔

"تم تو الٹی باتیں کرنے لگے۔ عمر میری بھی بہت کم ہے (حالانکہ چالیس سے کم نہ ہو گی) مگر اس موئے شرابی نے جلا جلا کر میری جوانی کا ستیاناس کر دیا۔ پھر بھی لوگ مجھ پر ہی ٹوٹتے ہیں۔ مگر اب یہ دیکھو نا کہ اگر میں گاہکوں کو لے لوں تو یہ چھوکری مجھ سے جلنے لگے گی"۔ اس نے ناز سے کہا۔ حفیظ نے اطمینان کا سانس لیا کہ شکر ہے اس بلا سے تو پیچھا چھوٹا۔ مگر پھر بھی بولا۔

"تم نے مجھے بڑا مایوس کیا مگر کہتی ٹھیک ہو۔ اب آیا ہوں تو خالی کیا جاؤں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ یہاں روز آیا کروں۔ اس لڑکی کے بہانے کم از کم تمہاری زیارت تو روزانہ ہو جایا کرے گی۔ میرا خیال ہے کہ اس معاملہ میں تو تم میرا دل نہ توڑو گی۔

عورت نے حفیظ کی چالوں سے عشق کا دھوکا کھایا۔ بوڑھے کی شاید یہ دوسری یا تیسری عورت تھی۔ معلوم نہیں اس کے ارمان کیسے تڑپے ہوں گے

جن کو وہ خدا جانے کن ذرائع سے فرد کرنے میں اس عرفان کی حد تک پہنچی ہو گی۔

"اب مشکل یہ ہے کہ یہ لڑکی تمہیں پسند نہ آئی اور میں تمہارے کام آنہیں سکتی۔ اس کے علاوہ میں نے ابھی اپنا کاروبار پھیلایا نہیں ہے کہ تمہارے لئے کسی دوسری لڑکی کا انتظام کر دوں۔ اس لئے ابھی تو میرے پاس یہی لڑکی ہے" عورت نے کہا۔ حفیظ نے قصداً خاموشی اختیار کی جیسے بیزار ہو رہا ہو اور بدرجہ مجبوری اس لڑکی کو قبول کر رہا ہو۔ چند منٹ بعد بولا۔

"یہ بھی تو نہیں دیکھا جاتا کہ اب تمہارے روزگار کو ٹھکراؤں۔ اب آیا ہوں تو جیسا کچھ تمہارے ہاں مال ہے۔ مجبوراً اسی کو کام میں لاؤں گا کہ تمہارا دل نہ ٹوٹے۔ لیکن دیکھو بھئی میری عادت ہے کہ جس برتن میں ایک دفعہ کھا لیتا ہوں اسے پھر کسی دوسرے آدمی کو کام میں نہیں لانے دیتا۔ چنانچہ اب یہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں آنا چاہیے۔"

"اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ اگر مجھے روز کا آنے والا ایک گاہک مل جائے تو میں خود پسند نہیں کرتی کہ پھر کوئی دوسرا آئے۔ کیونکہ اس میں ایک تو جلد بدنامی کا ڈر ہے دوسرے بیماریوں کا۔" عورت نے کہا۔ حفیظ اس

گفتگو سے مطمئن ہو کر کہنے لگا۔

"تو پھر کیا حساب رہیگا۔ روزانہ مجھے اجرت ادا کرنی پڑے گی یا مہینے مہینے حساب ہوا کرے گا؟"

"دیکھو ابھی تم نئے ہو اس لئے کچھ دن تک تو روزانہ ہی حساب ادا کرنا پڑیگا۔ ہاں اگلے مہینے سے جیسا معاملہ تم پسند کرو گے وہ ہو جائے گا۔" عورت نے کہا۔

"اچھا تو روزانہ کی اجرت کیا ہو جائے گی۔ یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ یہ لڑکی مجھے پسند نہیں مگر تمہاری خاطر سب کچھ منظور ہے۔ اِس لئے جتنی رعایت ممکن ہو سکے کر دو۔" حفیظ نے کہا۔

"اب تو رات بھر ہی کا حساب ہو گا؟" عورت نے پوچھا۔

"اور کیا" حفیظ نے کہا۔

"اب تم سے کیا زیادہ پیسے لوں گی۔ بس پانچ روپے روز ہو جائیں گے اس سے کم نہیں لوں گی۔"

حفیظ کا خیال تھا کہ وہ کم از کم دس روپے روزانہ مانگے گی مگر اس کا افسوں کامیاب رہا اور وہ ذرا سی حجت کے بعد پانچ روپے رات پر

آمادہ ہو گیا۔

چند منٹ بعد حفیظ اوپر کی کوٹھڑی میں چلا گیا اور تھوڑے سے انتظار کے بعد اُس نے زینے پر آمادۂ رفتار نہیں بلکہ نہایت مضمحل قدموں کی آہٹ سُنی۔ آہستہ سے دروازہ کھلا اور بھوری شدید بیزاری کے آثار سمیٹے چوکھٹ پر آکھڑی ہوئی۔

(۶)

حفیظ نے بھوری کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو اس فحش خانہ میں بھوری کچھ ایسی نظر آ رہی تھی جیسے وہ ایک غیر متعلق لڑکی ہے۔ جس کو یہاں کی کسی چیز سے سروکار نہیں بلکہ مارے باندھے مجبوراً یہاں آئی ہے۔

"آؤ بھوری۔" حفیظ نے آہستہ سے کہا۔ پچھلے جانوروں کی طرح اس کے لہجہ میں تحکم نہ تھا بلکہ ملائمت اور رحم نمایاں تھا۔ بھوری کی پریشانی تو کم ہوئی۔ مگر دل کا خوف ہلکا سا جاتا رہا۔ "گھبراؤ نہیں۔ آج کی رات صرف میری ہے۔ اور انشاء اللہ آئندہ راتیں بھی۔ اب تمہیں ہر شخص آ کر دق نہ کیا کریگا" حفیظ نے دلاسے کے انداز میں کہا۔ ان کلمات سے بھوری کی کوئی خاص

تسکین نہیں ہوئی۔ یہ غریب لڑکی چاہتی کب تھی کہ اس کالی سوداگری میں پڑی رہے۔ رضاور غبت کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ اس کو بھی سوتیلی ماں کے تشدّد (بربنائے معاش ہی سہی) اور دین و دنیا سے غافل باپ کی وجہ سے اپنے آپ کو بیچنا پڑتا تھا۔ اب خریدار چاہے ایک شخص ہو یا متعدد بھیڑیے۔ اس کے لئے سب برابر تھے۔ اُس کو لُٹنا ہی تھا۔ وہ بے جان جسم اور ایک سرد رُوح تھی۔ جس سے کھیلا جا رہا تھا اور اس کھیل سے اسے مطلق دلچسپی نہ تھی۔

غریب بھوری کی جوان روح نے بکنے سے قبل ضرور کسی محبت بھری آغوش کی تمنّا کی ہوگی لیکن جب اس کے سامنے اس قدر کثرت سے آغوشیں وا ہوئیں۔ تو وہ مقامِ محبت کو بھول گئی۔ اس کو یاد بھی نہ رہا کہ اسکے کسی زمانہ کے پُر ارمان دل میں، محبت کا خیال بھی آیا تھا۔

اس کا آج کا خریدار بھی روزانہ کے مست و بدکار خریداروں ہی کی طرح ایک خریدار تھا جو اس کو کھیل کھلا کر چل دیگا۔ مشین تھی جس کے انجر پنجر ڈھیلے کر کے رکھ دیے گئے تھے اور چند روز میں تو وہ بالکل کھکھڑا ہو جانے والی تھی۔ عورت کی جسمانی حفاظت و صحت کے لئے جب نظر پڑتی ہے۔ تو وہی نکاح سے حاصل کئے ہوئے ایک مرد پہ پڑتی ہے۔ وہ غریب عورتیں تو بہت

ہی جلد تباہ ہو جاتی ہیں جو اپنا ذریعہ معاش اپنی ہستی کو بنائے ہوئے ہیں۔

"بھوری کھڑی کیوں ہو۔ کیا تمہیں یہاں کہیں بیٹھنے کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی؟" حفیظ نے کہا۔ اور اس کے بعد آہستہ آہستہ اس نے اپنے یہاں آنے کی غرض، اپنا ارادہ، نیت اور تمام حال اس کو سنا دیا۔ پہلے تو بھوری کی سمجھ میں حفیظ کی باتیں مطلق نہ آئیں۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔ کہ ایک شخص مفت میں روزانہ پانچ روپے خرچ کرتا رہے گا۔ اور کوئی معاوضہ حاصل نہ کرے گا۔ مگر جب وہ رات بخیریت گزر گئی تو اسے حفیظ کے الفاظ کا یقین آنے لگا۔ حفیظ کے ساتھ پہلی آزاد شب گزارنے کے بعد جو دو تین راتیں اسی طرح گزاریں تو اسے کامل یقین ہو گیا کہ یہ مرد تجارتی نہیں۔ بلکہ اس کا محافظ ہے۔ اس کے جسم و ذات کا نگہبان ہے۔

ماحول بدلتے ہی بھوری بھی بدل گئی۔ اس کے بالجبر اختیار کی ہوئی فحش کاری کی مشین ایک دم بند ہو گئی۔ اور اب وہ گوشت پوست کی عورت بننے لگی۔ جس میں احساسات، نسائیت اور جذبات ہونے لازمی ہیں۔ جب اس کے ان جذبات پہ اس نے ایک مرد کا صحیح ہاتھ دیکھا تو اس کا دل

خوشی سے دھڑکنے لگا اور ان دھڑکنوں نے محبت کو بیدار کر دیا۔

دو تین صاف ستھری راتوں کے بعد ہی (جن میں حفیظ کا پُر محبت و ہمدردانہ طرزِ عمل سب سے زیادہ موثر ثابت ہوا تھا) بھوری کی تشنہ اور زخمی روح محبت مانگنے لگی۔ بھوری نے اس کے سامنے حفیظ کو کر دیا۔ اور یہ محبت پھر حفیظ کی ہو کر رہ گئی۔ بھوری نے بڑی شدت سے حفیظ کو چاہنا شروع کر دیا۔ نیلام پر چڑھا ہوا جسم بولیوں کی ٹھوکروں سے محفوظ ہو گیا۔

مگر میں نے راتوں کو صاف ستھری کہہ کر شاید ان کو لیلۃ القدر بنا دیا۔ پہلے یہی تو ہوتا تھا کہ بھوری بر جبر و اکراہ مجبوری کی معاشی راتیں گزار رہی تھی۔ ان میں اس کی پسند کو مطلق دخل نہ تھا۔ لیکن اب ان راتوں میں اس کو روزانہ قیمت ادا کر کے آنے والا ایک مرد مل گیا تھا۔ جو پیسے دے کر بھی اُس کے اُس جسم کو ہاتھ نہیں لگا رہا تھا جس کی معمولی داموں میں پہلے مٹی پلید ہوتی رہتی تھی۔ حفیظ اس پر احسان کر رہا تھا۔ بہت بڑا احسان، وہ احسان جس کا اس منڈی میں وہ خواب بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اپنے محسن کا شکریہ صرف زبانی ادا کر سکتی تھی۔

اس کا کوئی بدل پیش کرنے سے قاصر تھی۔ اگر کچھ پیش کر سکتی تھی تو وہی اپنی جبر و اکراہ کی ماری ہوئی ذات تھی۔ مگر اب جبر و اکراہ کا نام نہ رہا تھا۔ اب تو پسندیدگی تھی، محبت تھی اور رضا و رغبت تھی۔

" بھوری۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں شاید دو تین رات تک نہ آسکوں گا۔" حفیظ نے چوتھی رات کو کہا۔ اس کے بیس روپے تو یہاں صرف ہو چکے تھے۔ سات آٹھ کھانے میں۔ اب اس کے پاس صرف ڈیڑھ روپیہ رہ گیا تھا۔ اگر بھوری کو اپنے ہی لئے رکھنا ہے، اگر اس پر اپنا ہی قبضہ قائم رکھنا ہے تو آئندہ راتوں کے لئے روپے کی ضرورت تھی اور روپیہ حفیظ سے اتنا ہی دور تھا جتنا بغیر فیس کے بھوری پر قبضہ جاری رکھنا۔

"تم نہیں آؤ گے؟" بھوری نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"ہاں دو تین راتوں تک شاید نہ آسکوں گا۔" حفیظ نے کھوئے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

" تو پھر مجھے بھیڑیوں کے سپرد کر جاؤ گے؟ بھوری نے اس سے تقریباً لپٹتے ہوئے پوچھا۔

"کیا کوئی ایسی تدبیر نہیں ہو سکتی کہ جب تک میں نہ آؤں یہاں کوئی

نہ آئے ؟"

" اماں ایک رات ناغہ نہیں جانے دیں گی۔ کل ہی کہہ رہی تھیں کہ وہ تو تم کو زبان دے چکی ہیں۔ نہیں تو دس دس روپے دینے والے روز آآکر پھر جاتے ہیں۔ بس سمجھ لو جس رات تم نہ آئے اماں نہ معلوم کتنے کتوں کو میری طرف بھیج دیں گی۔"

" اچھا تو میں تمہاری اماں سے کہے جاتا ہوں۔ کہ آئندہ اپنی ناغہ راتوں کی آکر دگنی قیمت ادا کر دوں گا۔ بشرطیکہ وہ کسی کو نہ آنے دیں" حفیظ نے کہا۔ غریب بھوری کو اس سے اطمینان نہ ہوا۔ وہ اپنی حریص سوتیلی ماں کو خوب جانتی تھی۔ مگر اسے یہ راز معلوم نہ تھا کہ حفیظ نے اس کو ترکیب سے معاملۂ عشق میں مبتلا کر رکھا ہے۔

حفیظ نے صبح اپنے اسی افسوں سے کام لیا اور بھوری کی ماں کو منشا کے مطابق راضی کر لیا۔

(۷)

حفیظ بڑا پریشان تھا۔ اس کی وہی کیفیت تھی جیسے ایک نادار اور بے روزگار عیال دار انسان اپنے کنبہ کی کفالت کے لئے پریشان و سرگرداں پھرتا ہے۔ اس کی تعلیم کا سلسلہ تو پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ افلاس و بیکاری نے ایک ایک کر کے تمام چیزیں پان شاپ میں پہنچا دی تھیں۔ اب اس کے پاس کوئی ذریعہ نہ رہا تھا۔

دوسرے ہی دن اس نے دیانتداری سے روٹی کمانے اور ایک لڑکی کو مستقلاً بیسوا بننے سے روکنے کے ذرائع تلاش کرنے شروع کر دیئے۔ مگر معیشت کے اجارے داروں نے کہیں اس کو قبول نہ کیا۔ کئی

دفتروں، کچہریوں، فرموں اور فلم ساز کمپنیوں کی اس نے خاک چھانی مگر جیسے وہاں کی مٹی تک اس کے حق میں سوئی ہوئی تھی۔ باریابی تو کجا کسی نے پوچھا تک نہیں۔

کہاں ہیں معیشت کو مساوی کرنے والے ادارے، یہ کمیونزم، یہ سوشلزم کہاں سو رہی ہیں؟ زکوٰۃ، صدقات اور عشر دینے والے کہاں مرگئے؟ پہلے تو زکواۃ دینے والے ہاتھ اتنے تھے کہ لینے والے ہاتھ باقی نہ رہے تھے۔ اب وہ بھی کمیونزم کی طرح صرف دعویٰ مجہول کیوں بن کر رہ گئے۔ روپیہ ٹکسال میں تو برائے نام بنتا ہے۔ اصل جگہ تو اس کے بننے کی نفع جُو کی ذہنیت ہے، بلیک مارکیٹ، ٹریڈ یونین، انڈسٹری پلان اور "غلّہ زیادہ پیدا کرو" کا پُر فریب نعرہ کیوں صرف دل بہلاوا ہے۔

دفتروں سے مایوس ہوجانے کے بعد حفیظ نے مذہبی اور قومی اداروں سے رجوع کیا۔ اس نے ان مقدّس مقامات میں جا کر کہا کہ میری روپے سے امداد کرو۔ مجھے اپنے لئے تمہارا پاک پیسہ نہیں چاہیئے بلکہ ایک پاک لڑکی ناپاک ہوئی جا رہی ہے، بسوا بنی جا رہی ہے۔ فیشن یا جوانی کا لطف حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ صرف زندگی کی ہولناکیوں سے مجبور

ہو کر اس سے پوچھا گیا کہ آخر تم کون خدائی فوجدار ہو! کیا وہ تمہاری بہن بھانجی ہے؟ حفیظ نے جواب دیا۔ نہیں وہ میری بہن یا بھانجی تو نہیں مگر وطن کی بیٹی ہے۔ میرا یقین نہ آئے تو خود چل کر اس کی حالت دیکھ لو۔ اور اس کی امداد کرو۔ وہاں سے اس کو صاف جواب مل گیا کہ فحش کار عورتوں کی امداد کرنا ان کی مد سے خارج ہے۔ یہ روپیہ نیک کاموں کے لئے ہے حفیظ نے قہقہہ لگایا۔ نیک کام! بنے بنائے نیک کام!! بگڑے ہوئے نیک کاموں کو سنوارنا ان کے اصول میں داخل نہیں۔ یہ لا اور نفار دن کی اولاد و کیا یہی تمہارا مذہب ہے؟

ہر چیز تجارتی اصولوں پر چل رہی ہے۔ ہر طرف تجارت ہے اور تجارت بھی وہ جس سے رنڈی کا کوٹھا بھی شرمائے۔ بلیک مارکیٹ کی کال کوٹھڑی سیٹھوں کے منہ ٹے موٹے اور بے ایمان کی قبر سے بھی زیادہ گہرے پیٹ۔ پھر ہر شخص کی یہی اسپرٹ ہے کہ دوسرے کو حلال کر کے میں تو مالدار ہو جاؤں۔

حفیظ بڑبڑاتا ہوا ایک طرف چل دیا۔ اس کی دو راتیں ناغہ ہو چکی تھیں یعنی اس پر بیس روپے چڑھ گئے تھے۔ اب جیب میں صرف ایک

چونی باقی رہ گئی تھی جس کو اُس نے حقارت سے اُچھالا، لڑھکایا اور ایک دکان پر بیٹھ کر چھ پیسے کے دہی بڑے کھائے۔

تیسرا دن بھی سوچ اور پریشانی میں گزر گیا۔ اُس کو روزگار نہ ملنا تھا نہ ملا۔ جائز کمائی حاصل نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ چوتھا دن اور چوتھی رات بھی ختم ہو گئی۔ پانچواں دن طلوع ہوا اور آج حفیظ کی جیب میں صرف تین پیسے پڑے ہوئے تھے۔ اُن تین پیسوں کو سنبھالے ہوئے وہ رات ہونے تک پھرتا رہا۔

تین پیسے میں ایسی کیا چیز آ سکتی تھی جو زیادہ بھی ہو اور پیٹ میں کچھ معلوم بھی ہو۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ آدمی ایک پیسے کے چنے کھا کر پیٹ بھرا بھرا محسوس کر سکتا تھا۔ آج چنا ہی عنقا ہے۔ زندہ رکھنے کی ہر چیز غائب ہو چکی ہے۔ زمین وہی ہے، آسمان وہی ہے اور زمانہ اگر ان دونوں کی گردش سے بنتا ہے تو زمانہ بھی وہی ہے، لیکن ان کے درمیان میں جو چیز ہوتی ہے، جسے ماحول کہتے ہیں وہ بدل گیا ہے۔ ابھی اور اتنا بدلے گا کہ آدمی آدمی کو نہ پہچان سکے گا۔

حفیظ کھانے کی فکر میں اِدھر اُدھر چکر کاٹ رہا تھا۔ اُس نے ایک

چھوٹی اور خالی سی دکان میں دو آدمیوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا جن کے سامنے نوٹوں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دکان کا کوئی اثاثہ نہ تھا۔ مگر نوٹ اتنے تھے کہ کئی دکانیں شاید ان سے خریدی جا سکتی تھیں۔

حفیظ آخری بیڑی جلانے کے بہانے سے رکا۔ ایک آدمی نے دوسرے آدمی کو کچھ نوٹ دیئے۔ جن کو لے کر وہ روانہ ہو گیا۔ حفیظ کی سمجھ میں یہ سودا نہ آیا۔ نامعلوم یہ سٹہ تھا، چور بازار تھا، یا ساہوکارا تھا۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ اور نوٹ والے آدمی کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ ایک دفعہ کسی خیال سے اس کے ہاتھ پیر کپکپا اٹھے۔ لیکن اس نے تعاقب نہ چھوڑا۔

گلی میں مڑتے ہی حفیظ نے اس آدمی کو جا لیا۔ دو گھونسے کافی ثابت ہوئے۔ آدمی چکرا کر گرا تو حفیظ نوٹوں کا بنڈل نکال کر ہوا ہو گیا۔ رات کے نو بج چکے تھے۔ گلیاں نامانوس تھیں۔ جن میں اکا دکا آدمی اسے مل جاتا تھا بچنے کو وہ ایک تنگ سی گلی میں دور تک چلا گیا۔ مگر وہ گلی ایک ٹوٹے سے مکان کے سامنے جا کر ختم ہو گئی۔ اس مکان کے دروازے پر ایک ٹنڈ منڈ آدمی، خوبصورت سی ساڑھی میں ملبوس، ایک جوان عورت سے اختلاط کے ابتدائی اقدامات میں مصروف تھا۔ حفیظ جلدی سے الٹے

پیر لوٹ آیا اور تیز تیز قدموں سے چوڑی سی گلی میں مڑ گیا۔

دفعتہً دُور سے شور سنائی دیا۔ بھاگنے سے شبہ پیدا کراتا تھا۔ اس لئے وہ بے پروائی سے گلیوں میں مُڑتا مڑاتا دُور نکل گیا۔ یہاں تک کہ سڑک آ گئی۔ اس نے اسی وقت ایک تانگہ پکڑا اور اپنے محلّہ کا تانگے والے کو پتہ بتا کر مکان کی طرف چل دیا۔ یہاں سے مکان بڑی دُور نکلا اور اتفاق سے تانگہ پھر اُسی چھوٹی سی دکان کے سامنے سے گزرا جس سے ذرا فاصلہ والی گلی کے نکڑ پر بھیڑ ہو رہی تھی۔ تانگہ والا "ہٹو بابو" "ہٹو بائیسکل" کی آواز لگاتا ہوا نکل گیا۔

(۹)

جب حفیظ اپنی ذلیل سی کوٹھڑی میں داخل ہوا تو اس کا دل بڑے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یہ اس کا پہلا جرم تھا اور اس میں خوش قسمتی سے وہ سو فی صدی کامیاب ہوا تھا۔ جس شخص سے اُس نے روپے چھینے تھے۔ وہ بھی اگر اس کو دیکھ لیتا تو پہچان نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ گھونسوں کی شدید ضرب نے اس کو تیورا دیا تھا۔ اور وہ چور کو اچھی طرح دیکھ بھی نہ سکا تھا۔

حفیظ ہر طرح مطمئن تھا مگر پھر بھی ناآزمودہ کاری کی وجہ سے وہ ایک دو گھنٹے تک بلکہ تقریباً تمام شب ہی بے چین اور پریشان رہا۔ اس کی بھوک بھی غائب ہو چکی تھی۔ اگر تھوڑی بہت تھی بھی تو وہ بھی پکڑے جانے کے

خوف سے باہر نکلنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ آج اس کی خالی جیب اور بھری جیب میں کوئی فرق نہ رہا تھا۔ تہہ دستی کی حالت میں تو وہ فاقہ کرتا بھی تھا مگر آج جبکہ اُس کی جیب میں نوٹوں کا بنڈل تھا۔ آج بھی وہ فاقہ ہی کر رہا تھا۔

جلدی سے اُس نے دروازہ بند کیا، موم بتی جلائی اور دروازے کی طرف پشت کر کے اپنی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بیٹھ کر جلدی جلدی نوٹوں کو گننے لگا۔ کئی بار اس کو ایسا معلوم ہؤا جیسے دبے پیر کوئی آیا ہے اور دروازے کی درازوں سے اس کو دیکھ رہا ہے۔ گھبرا کر اُس نے کنڈی کھولی، گلی میں جھانکا، سڑک پر کان لگائے مگر کوئی نہ تھا۔ صرف اس کا کچا ضمیر شرارت کر رہا تھا۔

ڈھائی سو روپے کے نوٹ تھے۔ کوئی بڑی رقم نہ تھی مگر حفیظ کو تو جیسے قارون کا خزانہ مل گیا۔ اگر میں ایک زمانے تک مارا مارا پھرنے کے بعد نوکری حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو چالیس پچاس روپے سے زیادہ کی نوکری نہیں مل سکتی تھی اور یہ چالیس پچاس روپے بھی تیس دن کے بعد نصیب ہوتے۔ یہ سلسلہ تو بڑا ہی کامیاب رہا کہ ایک ہی حملہ میں یکمشت ڈھائی

سو روپے مل گئے۔

ان روپوں کو حاصل کرنے میں حفیظ کا صرف اتنا قصور تھا کہ اس نے جبر سے کام لے کر اور معاوضہ میں بغیر کچھ دیئے ان کو حاصل کیا تھا۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ اس نے معاوضہ میں کچھ نہ دیا تھا۔ اس نے جرم کے باب میں فطری جھجک قربان کی تھی، زندگی کا کوئی اچھا یا بُرا اُصول توڑا تھا۔ ضمیر اگر کوئی چیز ہے تو اُسے آلودۂ عصیاں کر لیا تھا۔ یہ تو بہت بڑا معاوضہ تھا۔ اس کے علاوہ اس نے حصولِ زر میں بلا اذن جبر ہی سے تو کام لیا تھا۔ جو اس یورش کے مقابلہ میں عشرِ عشیر بھی گھناؤنا فعل نہیں ہے جس میں زمین کے ایک ایک انچ کے لئے سینکڑوں انسان قتل کر دیئے جاتے ہیں، ٹینکوں اور ہوائی جہازوں سے لوگوں کو دُھن کر رکھ دیا جاتا ہے۔ زردار اور تجار ایک پیسہ کے نفع کی خاطر خاندان کے خاندان کو نیلام کر ڈالتے ہیں۔ بے گھر کر دیتے ہیں۔ اور پھانسی پر اپنے شکار کو چڑھا دیتے ہیں۔

روپے کی تعداد معلوم کر کے حفیظ مسرت سے اچھل پڑا۔ او فوہ وہ اس روپے سے بھوری کی کس قدر آئندہ راتوں کی نگہبانی کر سکے گا——

اور ہاں اِس میں سے کچھ روپیہ اسے گھر بھی تو بھیجنا ہے۔ اپنی ماں سے
اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ پرائیویٹ پڑھائیوں کے ذریعہ روپیہ کمائیگا۔
اور اس کے پاس بھیجے گا۔ ضرورت نہیں ہے کہ اس کی بہن کو تھوڑے
سے روپیہ کی خاطر کسی بھلے آدمی کے ہاں بچّوں کو پڑھانے کے لئے بھیجا
جائے۔ اس زمانے میں کس کا بھروسہ ہے۔ بظاہر لوگ بھلے نظر آتے ہیں لیکن
ان کے دلوں پر شیطان کی حکومت ہے۔ شمیم (اس کی بہن) جوان ہے
صورت شکل بھی پائی ہے۔ کسی گھر میں روزگار کی خاطر بچّے پڑھانے گئی
لیکن صاحب خانہ کی نیّت میں فساد آگیا تو بھوری میں اور شمیم میں کیا فرق
رہے گا۔ ایسی صورت میں وہ پہلے گھر کی آگ بجھائے گا یا بھوری کی جھونپڑی کی
حالت یہ ہے کہ روپے کی کوئی مستقل سبیل نہیں لیکن اب روپیہ کی کیا فکر
ہے۔ اُن سے چھینوں گا جن کے پاس بلاوجہ فالتو بھرا ہوا ہے اور اس جماعت
کو سے دوں گا جو روپے کی غلط تقسیم کی بنا پر فاقوں میں مبتلا ہے۔ اگر معاش
میں یکسانیت پیدا نہیں کی جاسکتی۔ اگر اجرتوں کا مساوی تناسب نا قابلِ
عمل ہے تو زکواۃ کی مد کو کیا ہو گیا ہے۔ روپیہ کا انبار، شخصی ملکیت صرف اس
لئے ہے کہ ضرورت مند سوسائٹی اِس میں سے اپنا حق پاتی رہے۔ جب

ایسی صاحب احتیاج سوسائٹی کو بھلا دیا جائیگا تو ہر چیز اور ہر جذبے کی بلیک مارکیٹ کھلے بغیر نہ رہے گی۔ لوٹ کھسوٹ، قتل اور غارت گری، بے اعتمادی اور معاشی طوفان ابھی تو کچھ نہیں ہیں لیکن چند روز بعد ایسے جھگڑے چلیں گے کہ یہ بنے ہوئے اَن داتا روٹی کے محتاج ہوں گے۔

پھر یہ سبھائیں، یہ پروپیگنڈا کی سبھائیں، یہ قومی آشرم جنہوں نے ملکی صنعت کو ترقی دینے کا سیاہ جھوٹ بول کر غیر ممالک سے تجارتی رشتہ جوڑنے کے جو پلان بنائے ہیں وہ ننگوں اور بھوکوں کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیئے جائیں گے۔ اس وقت صرف ایک مادی کشمکش باقی رہ جائے گی۔ اور وہ یہ کہ مذہب اور اس کا عملی مفاد چونکہ ایک خوابِ نشاط بن چکا ہے یا بنا دیا گیا ہے۔ اس لیے من مانے اور طرح طرح کے متضاد اصول اور قوانین معیشت، معاشرت اور تہذیب کی اس طرح بوٹیاں نوچیں گے کہ انسانیت تھرا کر غش کھا جائے گی۔

اپنی بہن کا خیال آتے ہی حفیظ نے سو روپے علیحدہ گن کر رکھ دیئے شکر ہے کہ اس کو حقیقی ماں ملی ہوئی تھی جس پر معاش کا دروازہ اگرچہ بہت تنگ تھا مگر اس نے اس تنگ دستی میں بھی کچھ ایسے اصول اپنا رکھے تھے کہ

ان کی نگرانی میں اس کی بیٹی شمیم بھوری نہیں بن سکتی تھی۔ مگر جوان تھی۔ اور چھپے پانی کی ہموار سطح کے نیچے نامعلوم کہاں گڑھا آ جائے۔ اس کی ماں کا ذریعہ آمدنی بھی کچھ نہ تھا۔ بس ایک مکان تھا جس کے کرائے پر گزر اوقات ہو رہی تھی۔

حفیظ نے پھر تمام نوٹوں کو باہم ملا دیا۔ اس کے پاس کوئی صندوق نہ تھا کہ جس میں اپنی دولت کو چھپاتا۔ اس لئے کوٹھڑی کے کچے فرش کا ایک کونہ کھود کر اس نے سردست نوٹوں کو اس میں دفن کر دیا۔ پھر سونے کے لئے موم بتی گل کرنے کے ارادہ سے اٹھا۔ دفعتہً اس کی نظر کواڑ کے پیچھے پڑی جہاں ایک لفافہ پڑا ہوا تھا۔ جلدی سے اس کو اٹھایا۔ کھول کر پڑھا تو یہ اس کی ماں کا خط تھا۔

(۹)

حفیظ نے خط کو روشنی کے سامنے کیا اور پڑھنے لگا۔

حفیظ بیٹے!

دو تین ماہ سے تمہارا کوئی خط نہیں آیا۔ دل سخت پریشان ہے
تیری بہن بھی رات، دن تیرے خیال میں روتی رہتی ہے خدا
کے لئے جلد اپنی خیریت سے مطلع کر۔ میرے لال کیا تو اپنی
ماں کو بالکل ہی بھول گیا۔

میرے لال! تو شاید خفا ہو گیا کہ تیری امّاں نے بہت دنوں سے
تیرے پاس خرچ روانہ نہیں کیا۔ تو نے ہی تو منع کر دیا تھا۔ خیر

پھر بھی میرا دل نہیں مانتا۔ میں انشاءاللہ اگلے ہفتے تک
تیرے پاس تھوڑے سے روپے روانہ کردوں گی۔ میرے
پاس تو بچتا ہی کیا۔ یہ تیری لاڈلی بہن کی کمائی ہے۔

حفیظ لفظ "کمائی" پہ رک گیا۔ اُس کے کانوں میں بھوری کی ماں کے الفاظ گونجنے لگے اور پھر بھوری کی کمائی کا خیال اُسے آنے لگا۔ کیا میری پیاری بہن کو بھی اماں نے ایسی ہی کسی کمائی پر لگا دیا ہے۔ اُس نے خوف و رنج کے ساتھ سوچا۔ اس کے سامنے اپنی ضرورت مندی کی مثال موجود تھی کہ اس نے اپنی یا بھوری کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کس طرح روپیہ حاصل کیا تھا۔ پھر وہ ضرورت بھوری کی کب رہی تھی۔ اب تو وہ اس کی اپنی ضرورت بن گئی تھی۔ بھوری کی بر بنائے مجبوری عصیاں کاری کی روک اس کا منتہائے خیال تھا —— اس کی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت' —— ورنہ وہ تو فاقے کر کے اور کبھی پیٹ بھر کر بھی اپنے دن گزار رہا تھا لیکن نہیں شمیم بہت ہی اچھی لڑکی ہے۔ بری تو بیچاری بھوری بھی نہ تھی۔ اس کو تو زبردستی بُرا بنا دیا گیا ہے شکر ہے کہ میری بہن کو بُرا بنانے والا ماحول اس سے بہت دُور ہے۔ اماں با اصول ہیں اور سخت قسم کی نگران۔ یہ سوچ کر

اُس نے پھر خط پڑھنا شروع کیا۔

"میری شمیم کو خدا نے ساٹھ روپے ماہوار کی پڑھائی گھر بیٹھے بھیج دی تھی۔ تین مہینے تک تو وہ پڑھاتی رہی پھر ایکا ایکی اُس نے اپنی آمدنی کے اس ذریعہ کو خود توڑ لیا اور چپ چاپ مکان میں آبیٹھی۔ اب میں بہتیرا پوچھتی ہوں تو کوئی وجہ نہیں بتاتی۔ بس چپ ہے۔

مجھے خطرہ ہوا کہ شیطان کے کان بہرے۔ کہیں ایسی ویسی بات تو نہیں ہو گئی۔ شمیم محلہ میں ہی پڑھانے جاتی تھی تم خان بہادر رضا احمد صاحب سے تو واقف ہی ہو گے۔ وہی جو ڈاک خانوں کے سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ ان کی دونوں چھوٹی بچیوں کو پڑھاتی تھی اپنی شمیم۔

ایک روز میں نے رضا صاحب کی ماما کو بلوا کر پوچھا کہ آخر کیا بات ہے شمیم کا سپرنٹنڈنٹ صاحب کی بیوی سے کوئی جھگڑا تو نہیں ہو گیا تھا کہ اس نے وہاں کی پڑھائی چھوڑ دی۔

ماما ہے بڑی حرّافہ۔ اوّل تو اس نے کچھ نہیں بتایا
صرف اتنا کہا کہ بگیم نے (رضا صاحب کی بیوی) دو تین دفعہ
میاں کو (رضا صاحب) شمیم سے اکیلے میں ہنستے بولتے دیکھ
لیا تھا۔ اس پر دونوں میاں بیوی میں ایسا جھگڑا ہوا کہ
بگیم روٹھ کر اپنے میکے ولایت نگر چلی گئیں۔ اب واپس
نہیں آئے گی۔ تعجب ہے بیوی کہ تم نے کچھ نہیں سُنا حالانکہ
سارے محلّہ میں اس کا چرچا ہو رہا ہے اور کافی بدنامی ہو
رہی ہے۔ میاں مارے شرم اور رسوائی کے دورے
پر چلے گئے ہیں۔

بیٹے جب مَیں نے ماما سے یہ کلمات سُنے تو میری
آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔ اسی وقت شمیم سے مَیں نے تمام
حال معلوم کرنا چاہا تو میری بچّی کی روتے روتے ہچکی بندھ
گئی۔ بہر حال اُس نے صاف صاف سب کچھ بتا دیا معاملہ
فقط اتنا نکلا کہ رضا صاحب نے دو ایک دفعہ شمیم سے مذاق
کیا تھا۔ ایک دفعہ اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا تھا۔ مگر میری شمیم نے غصہ

سے ان کو ڈانٹ دیا تھا۔

دیکھا جائے تو ایک کنواری شریف لڑکی کو ہمیشہ کے لئے بدنام کرنے کو بھی بہت بڑی بات ہے۔ ان کی بیوی نے جو غل مچایا اس سے تو ہماری اچھی خاصی رسوائی ہو گئی۔ نہ میں محلہ میں منہ دکھانے کے قابل رہی تھی اور نہ میری شمیم۔

ایک مہینے کے بعد رضا صاحب دورے سے لوٹ آئے تو اب بھی انہوں نے محلّہ والوں کی نظروں کو کڑوا پایا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ رضا بُرے آدمی نہیں ہیں۔ انہوں نے دو ایک دن میں تمام محلّہ والوں کو جمع کر کے ان کے سامنے حلفیہ کہا کہ شمیم ایک پاک دامن لڑکی ہے اُس کو رُسوا نہ کیا جائے سب خطا میری ہے کہ میں نے ایسی نیک لڑکی سے ہنسی مذاق کیا۔

خدا کا شکر ہے کہ یوں ہماری خاص طور پر میری کنواری بچّی کی عزّت بحال ہو گئی۔ اب تمام لوگ شمیم کی عزّت کرتے ہیں۔ رضا صاحب نے اتنا ہی نہیں کیا بلکہ تاوان کے طور پر چپکے سے

میرے پاس ہزار روپے بھی بھجوائے۔ شمیم نے ان کو واپس کر دیا۔

تیسرے دن رضا خود روپے لے کر آئے اور میری منت سماجت کر کے مجھے دے گئے۔ میں مجبور ہو گئی تھی۔ ناچار قبول کرنے پڑے لیکن شمیم کو خبر نہیں ہے۔ اب ہم خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ کچھ دن بعد انشاء اللہ تو نوکر ہو جائیگا۔ تو سب دلدر دور ہو جائیں گے۔

خط کا جواب بہت جلد دینا بیٹے! فقط

تیری امّی

(۱۰)

حفیظ اس خط کو پڑھ کر سناٹے میں آ گیا۔ اُس کے سامنے دو مختلف ماحول کی یکساں واقعاتِ حیات رکھنے والی لڑکیاں تھیں۔ اگر وہ شمیم کے ذریعہ اپنی ماں کا یا ماں کے ذریعہ شمیم کا بیان اور رضا کے حلف کو سچّا تسلیم کر لے تو بھی کسی طرح پاکدامنی کے باب میں شمیم سے پیچھے نہ تھی ایک لڑکی نے اپنی عزّت کا سودا یوں نہیں کیا کہ وہ رات دن کے فاقوں میں مبتلا نہ تھی۔ اس کی ماں سوتیلی نہ تھی اور اس کا باپ بھی زندہ نہ تھا کہ جو بوڑھا ہو کر شراب کی بدمستی میں اپنے گھر اور اولاد سے غافل ہو جاتا۔ دوسری کے ماحول میں یہ سب چیزیں تھیں۔ اور اسے بدکاری میں زبردستی

دھکیلا گیا تھا۔ وہ بھی اپنے پہلے مرد کے ساتھ اسی درشتی اور سختی سے پیش آئی ہو گی جیسے شمیم رضا کے ساتھ آئی ہو گی۔ رضا شریف تھا کہ اس نے شمیم کو بے داغ چھوڑ دیا۔ بدنصیب بھوری کا پہلا آدمی کمینہ ہو گا کہ اسے اس کی بیچارگی پر ترس نہ آیا۔

مگر کیا رضا شریف تھا؟ وہ بھی کسی طرح بھوری کے پہلے مرد سے کمتر ثابت نہ ہوتا۔ اگر اس کو بھی شمیم ایسے ہی اختیارِ کلّی کے ساتھ کہیں اکیلی مل جاتی۔ شمیم کو جو رضا نے بخشا اس میں اس کی شرافت کو دخل نہ تھا بلکہ ایک تو بھرا ہوا گھر تھا۔ جس میں اس کی اپنی جائز دطالب حق بیوی کا وجود، دوسرے تنگیٔ وقت و موقع۔ بس اِن موانع کی وجہ سے شمیم بچ گئی۔ ورنہ وہ بھوری بنے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

اِن دلخراش خیالات میں حفیظ کی طبیعت کی بدمزگی بڑھتی گئی۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ شمیم یا رضا کا بیان صحیح ہو، رضا کا حلف سچا ہو، یا حقیقتِ حال کچھ اور ہی ہو۔ لیکن اس کی ماں نے خط میں اس کے (حفیظ) غم و غصہ کے خیال سے اس کو چھپایا ہو۔ بات کچھ ایسی ہی معلوم ہوتی ہے ورنہ رضا کا گھر پر آ کر تاوان کے روپے داخل کرنے کے کیا معنی، کس چیز کا

تاوان؟ رسوائی جتنی ہونی تھی ہو چکی تھی ۔ پھر یہ تاوان کیسا؟ یہ تاوان تھا یا فیس؟

فیس کا خیال آتے ہی حفیظ غصّہ سے کانپنے لگا۔ اتنی بڑی فیس ادا کر کے کیا پاجی رضا میری بہن کو اپنے نفس کی تسکین کے لئے ناجائز طور پر مستقلاً خریدنا چاہتا ہے۔ فیس میں بھی ادا کر رہا ہوں۔ لیکن میری اور رضا کی فیس کا مصرف بالکل جداگانہ ہے۔ میں بھوری کے گھر میں دوسرے عصیاں کاروں کے قدموں کو روکنے کے لئے حفاظت کر رہا ہوں، اپنے نفس کے لئے نہیں بلکہ خالص جذبۂ تحفظ کی بنا پر۔ اور رضا ۔ وہ مردُود ایک بوڑھی ماں کی غیر محفوظ آغوش میں سے ایک معصوم لڑکی کو نکال کر اس راہ پر ڈال رہا ہے جس راہ پر جانے سے میں بھوری کو روکنے کے لئے بے مزہ فیس ادا کر رہا ہوں۔

حفیظ کا غصّہ بڑھ گیا۔ وہ غیظ میں پیچ و تاب کھانے لگا۔ اس کی ماں اس کو دھوکا دے رہی ہے۔ شمیم دھوکا دے رہی اور اپنے غارت گر رضا کو بچا رہی ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اسی وقت اڑ کر وطن جا پہنچے اور رضا کا گلا کاٹ ڈالے۔ کیا دنیا میں سوائے معاشی

ابتری و پریشانی کے کچھ ہے ہی نہیں۔ کیا زندگی کی سختیوں کو ملائم کرنے کا ذریعہ سوائے عصمت فروشی کے اور کچھ نہیں ہے۔

حفیظ مسئلہ حیات پر صرف اپنے نظریئے سے روشنی ڈالنے کا عادی تھا وہ کوئی متقی، پرہیزگار یا با اصول انسان نہ تھا۔ بلکہ اس نے اب تک ذہنی طور پر کوئی مذہب ہی اختیار نہیں کیا تھا۔ اسے بھوری کی تاریک زندگی سے صرف اس وجہ سے ہمدردی ہو گئی تھی کہ خود بھی ویسی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ اپنی سی زندگی رکھنے والے ہر انسان سے ہمدردی رکھتا تھا وہ ایک بے ضابطہ کا انسان تھا جو مختلف ضابطوں سے بھری ہوئی دنیا میں زندگی گزار رہا تھا۔ حفیظ ہی پر کیا موقوف ہے۔ یہاں ہر شخص اپنے من مانے ضابطہ کو چلا رہا ہے اور اس پر چل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی ہزاروں شاخوں میں نمایاں ہے۔ اور ہر شاخ اپنی جگہ پر ایک مستقل میدانِ جنگ ہے۔

حفیظ نے چارپائی پر لیٹ کر پھر اپنی والدہ کے خط کو پڑھا۔

شمیم! اماں نے تو خط میں تمام واقعہ کو اچھی طرح ڈھانک کر لکھا ہے مگر نہ معلوم کیوں میرا دل اس کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتا۔ تمہاری معصوم

صورت میری آنکھوں کے سامنے آتی ہے اور میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ تمہارے مبارک سر سے نسائیت کا تاج گر گیا۔ (حفیظ پھر غیظ سے کھولنے لگا) یہ خون کھولانے والا خیال مجھے اپنی ذات سے باغی بنائے جا رہا ہے۔ یہ کیا غضب ہے کہ میں ایک غیر لڑکی کی تو بگڑی ہوئی عزت کو مزید تباہ ہونے سے بچانے کے لئے ہر طرح جد و جہد کر رہا ہوں مگر اپنی عزیز بہن کے لئے کچھ نہیں کیا۔

ہر شے سے بیزاری کے بعد گھر کے افراد کی محبت نے حفیظ کے دل میں ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالنی شروع کی۔ جس کے قوانین وہی تھے جو ایک حقیقی مذہب کے ہوتے ہیں مگر یہ خیال چونکہ اس کے دل میں بالکل پہلی دفعہ آیا تھا اس لئے یہی اس کا پہلا اور نیا مذہب تھا۔ وہ شمیم کو تباہ نہیں ہونے دیگا۔ اماں کی، شمیم کی اور بھوری کی زندگی پیسوں کی کمی کی وجہ سے بھگی جا رہی ہے۔ اس لئے اس کا فرض ہے کہ وہ معیشت سے لڑے اور ان تینوں کے لئے گزارہ کا ذریعہ فراہم کرے۔

ذریعہ کی اچھائی برائی کا حفیظ نے مطلق خیال نہیں کیا۔ ابھی اس کا

مذہب اتنا ہی تھا کہ وہ عورت کی عصمت کو زمانے کی سچائی سمجھنے لگا تھا۔ دوسری اونچ نیچ تک ابھی اس کے دماغ کی رسائی نہ تھی۔ اس کی زندگی میں آئندہ جتنے حادثے آتے گئے ان کے منفی اثرات اس کا مذہب بناتے گئے سردست دوچار ہی حادثے رونما ہوئے تھے اس لئے اس کا مذہب بھی ابھی دوچار قدم ہی بڑھا تھا۔

حفیظ کو صبح تک نیند نہ آئی۔ بار بار اس کو اپنی بہن کا خیال آتا رہا۔ اور وہ غصہ و پریشانی کی حالت میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔ اس کے گھر میں آگ لگ گئی۔ مگر وہ دوسروں کے گھروں کی آگ بجھانے میں مصروف ہے۔

اگر اسے دوسرے روز شمیم کا خط نہ مل جاتا تو وہ شاید بھوری کو اس کے حال پر چھوڑ کر رضا کو جہنم واصل کرنے اور شمیم کو بچانے وطن ہی پہنچ جاتا۔ شمیم کا خط بہت مختصر تھا مگر اس کے ایک ایک حرف سے صداقت ٹپک رہی تھی۔ اس نے اپنے بھائی سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ شمیم کو یقین تھا کہ حفیظ اماں کے خط سے مطمئن ہونے والا انسان نہیں ہے۔ اِس لئے اس نے رضا کے جتنے سفیہانہ اقدامات تھے۔ سب لکھ دئے تھے اور آخر میں اس کو یقین

دلایا تھا کہ ایک چور قسم کے شریف آدمی کی بزدلانہ حرکات ایک مسلمان عصمت مآب لڑکی کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔

خط پڑھ کر حفیظ کا دل مسرّت سے لبریز ہو گیا۔ کہ اس کے گھر میں ابھی آگ نہیں لگی۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک بے دین اس قسم کی آتش زدگیوں سے کیوں اس قدر متاثر ہو جاتا تھا۔ خود اس کی زندگی کا جب کوئی نصب العین نہ تھا تو وہ دوسرے نصب العین اور اصولوں کو ٹوٹتے دیکھ کر کیوں رنجیدہ ہوتا تھا۔ اس کا جواب ہر جرم پسند اور نکوکار انسان دے سکتا ہے۔

جب اسے نسیم کی طرف سے اطمینان ہوا تو بھوری یاد آنے لگی۔ دیکھا جائے تو ان دونوں لڑکیوں سے اس کے تعلقات یکساں قسم کے تھے۔ چار پانچ راتیں ناغہ ہو گئی تھیں۔ اس لئے کافی فیس چڑھ گئی تھی چنانچہ رات ہوتے ہی حفیظ جا پہنچا۔ کچھ تحفے بھی لیتا گیا۔ بھوری کے لئے اور بھوری کی ماں کے لئے بھی اس سے بھی تو اس کو تعلقات قائم رکھنے تھے۔

"شکر ہے میاں تمہاری صورت تو نظر آئی۔ میں تو سمجھی تھی کہ چل دیئے دھوکا دے کر" بھوری کی ماں نے ناز سے کہا۔

بکس طرح ممکن تھا کہ میں تمہیں چھوڑ دیتا۔" حفیظ نے کہا اور بادلِ ناخواستہ جو چیزیں لایا تھا وہ بھی اس کی نذر کیں۔ ان کے علاوہ ناغہ شدہ فیس بھی ادا کر دی۔

"بڑے کھرے آدمی نکلے تم تو حفیظ میاں۔ میں نے بھی تمہاری غیر حاضری میں تمہاری امانت کو تمہارے ہی لیئے رکھ چھوڑا ہے۔ جاؤ اسے ابھی تمہارے پاس اوپر بھیجتی ہوں۔" عورت نے کہا۔

حفیظ اُوپر چلا گیا۔ پلنگ پر اب تک وہی چادر تھی جس کو وہ بچھا ہوا چھوڑ گیا تھا۔ وہی بوسیدہ دری تھی۔ ایک طرف کئی روز کے مرجھائے ہوئے پھول پڑے تھے۔ حفیظ یہاں کبھی پھول لے کر نہیں آیا تھا۔ پھر یہ پھول یہاں کیسے آئے ؟ کیا اس کی غیر حاضری میں خلافِ معاہدہ عورت نے دوسرے گاہکوں کو بلایا تھا۔ بھوری سے دریافت کروں گا۔ اگر اس نے بھی حقیقت کو مجھ سے چھپایا تو مجھے سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ رنڈی بن چکی ہے۔ اور اب اُسے کسی حفاظتی فیس کی ضرورت نہیں بلکہ وہ اب آزادی سے اپنی دکان چلا سکتی ہے۔ ٹھاٹھ سے اپنے کوٹھے کو آباد کر سکتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ اپنے محور سے ہٹ گئی ہے۔ بلکہ محور نے اسے چھوڑ دیا۔ اب وہ اپنے من مانے کالے تارے

کے گرد گردش کرسکتی ہے یا ٹوٹ کر اور ایک وقتی روشنی چھوڑ کر خلا میں گم ہوسکتی ہے۔

حفیظ مرجھائے ہوئے پھولوں کے ڈھیر کو پیر سے کریدنے لگا۔ اس میں اس کو چند دونے بھی پڑے ہوئے نظر آئے۔ کوئی اچھا خوش مذاق ہار اور مٹھائی لے کر آیا تھا — یہ ہار اور مٹھائی — اور ادھر شمیم کی ماں نے رضا کے ایک ہزار روپے قبول کر لئے تھے۔ لیکن شمیم نے شکر ہے۔ اُن ہزار روپوں کا معاوضہ ادا نہیں کیا تھا۔ اگر بھوری نے وہ دونوں اور چند ہار قبول کر لیا تھا تو وہ بہت سستی لڑکی ہے۔

(۱۱)

حفیظ کئی منٹ تک بیٹھا ہوا اسی قسم کی شش و پنج میں مبتلا رہا۔ یہاں تک کہ بھبوری آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اس نے کوٹھڑی کی موم بتی کو گل کیا، لالٹین کو طاق پر رکھا اور بھسکڑا مار کر دری پر بیٹھ گئی

وہ حفیظ سے خفا تھی۔

آج اُس نے کئی روز بعد کنگھی کی تھی۔ چٹیا گوندھی تھی اور کپڑے بدلے تھے۔ جب سے حفیظ گیا تھا وہ لباس و آرائش کی طرف سے اس طرح بے پروا ہو گئی تھی جیسے پردیس گئے ہوئے شوہر کی محبت پرست بیوی سنگھار کی جانب سے بے پروا ہو جاتی ہے۔ پہلی رات کو اس نے حفیظ کو بھی عام گاہک کے علاوہ

کچھ نہ سمجھا تھا۔ لیکن اُسی رات کی بے خلل گھڑیوں میں اُس نے اندازہ لگا لیا۔ کہ یہ دوسروں کی طرح معاوضہ طلب آدمی نہیں بلکہ اس کا اپنا ہے پھر تو تین چار راتوں تک حفیظ آتا رہا۔ باتیں کرتا رہا اور فیس ادا کر کے بھی معصومانہ سوتا رہا اور اس کی نگرانی کرتا رہا۔ اس نے بھوری کی زندگی کے غلط بہاؤ کو روک دیا اور اس طرح ایک اکھڑی ہوئی عورت کو ثابت قدم بنا کر اسے جیت لیا۔

چار پانچ راتوں کی غیر حاضری نے تو بھوری کو اور بھی بے چین کر دیا تھا۔ تین رات تک تو اُس نے صبر کیا۔ جب حفیظ چوتھی شب کو بھی نہ آیا تو بھوری کا محبت کا مارا ہوا دل رونے لگا۔ اس نے حفیظ کی یاد میں تڑپنا شروع کیا لیکن اس کو تڑپنے نہ دیا گیا۔ کیونکہ بھوری کی ماں تین رات کا نقصان کر کے چوتھی رات کے حرج کے لئے تیار نہ تھی۔ ایسے گھروں میں آنے والے اور بلانے والے لوگوں کے وعدے بھروسے کے قابل نہیں ہوتے۔ اس لئے بھوری کی ماں بھی یہ خیال قائم کرنے میں حق بجانب تھی کہ اب حفیظ نہ آئیگا اور ایک آوارہ آدمی کے الفاظ کا یقین کر کے اپنی تجارت کا نقصان کرنا بیوقوفی ہے۔ چنانچہ اس نے چوتھی شب کو ایک دس روپے والا گاہک بُلا لیا۔ مگر بھوری مچل گئی اس نے اپنی ماں کو کھری کھری سنائیں

جب اُس نے مانا ہی نہیں اور برابر اس کو اوپر دھکیلتی رہی تو اس نے اپنی ماں کو دھمکی دی کہ اگر اس نے اس کو بہت مجبور کیا تو وہ ابھی شور مچا کر محلّہ والوں کو جمع کر لے گی۔ یہ دھمکی بہت خطرناک تھی۔ کیونکہ یہ کاروبار نہ صرف غیر قانونی طریقے پر چل رہا تھا بلکہ اس محلّہ میں چند بھلے آدمی بھی رہتے تھے۔ جن کے علم میں یہ تجارت ابھی نہ تھی۔ وہ تو بھوری کی ماں کا مکان گلی میں اس طرح واقع تھا کہ کوئی آ بھی جائے تو لوگوں کی نظر میں بہت کم آسکتا تھا۔

اس دھمکی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس رات کا حق خود بھوری کی ماں کو ادا کرنا پڑا۔ ایک دو روز بعد آخر حفیظ آ گیا۔ مگر اس نے یہ واقعہ اس سے چھپایا اگر باسی پھول اور دونے چغلی نہ کھاتے تو حفیظ گمان نہیں کر سکتا تھا کہ یہاں کچھ ہوا ہے یا کوئی آیا ہے۔

بھوری کو اس طرح خفا دیکھ کر حفیظ نے اس کو چھیڑا۔

"کیوں بھئی کیا ہوا بھوری۔ کیوں روٹھ گئیں ہم سے ؟"

"آپ کی بلا سے۔ آپ تو چھوڑ کر چل دئے تھے۔" یہ فقرہ اِس طرح کہا جیسے اسے سب کچھ کہنے کا حق ہے۔

"اچھا یہ بدگمانی تھی تم کو کہ مَیں چھوڑ کر چل دیا ہوں"؟

"چھوڑ کر چل دینے کے سر پر اور کیا سینگ ہوتے ہیں۔ اتنے دنوں میں آج آئے ہیں آپ۔"

"لیکن آ تو گیا۔ غدّاری تو نہیں کی مَیں نے تمہاری طرح۔" حفیظ نے کہا۔

"میں نے غدّاری کی! کیا غداری ہوئی مجھ سے"؟ بھوری نے پوچھا پھر چند لمحے بعد بولی: "مَیں سمجھ گئی۔ اگر امّاں آپ سے اس واقعہ کا ذکر نہ کرتیں تو میں کیے بغیر نہ رہتی۔ مگر اس میں میرا کیا قصور تھا؟" بھوری نے کہا۔ اس کی تمام خفگی کافور ہو گئی۔ اسے یہ مغالطہ ہوا کہ حفیظ غیر مرد کی مداخلت کے واقعہ سے باخبر ہو گیا ہے اور ابھی اس پر خفا ہونے والا ہے۔ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور عجزِ مجسم بنکر حفیظ کے سامنے آگئی۔

حفیظ کو اب تک شبہ ہی تھا۔ اس وقت بھوری کے بے تکے پن نے اسے یقین میں بدل دیا۔ اس کے سامنے ایک لُٹی لٹائی لڑکی کھڑی تھی۔ سیدھی سادھی، گناہوں کے باوجود ناکردہ گناہ، سکّہ بازار میں ابھی آیا ہی تھا۔ اِس لئے گھسا نہ تھا۔ صاف چہرہ، بھرے ہوئے جوان رخسار۔ دیکھنے

نہیں صرف جوان لڑکی تھی، کوئی حور یا پری نہ تھی۔ حفیظ غور سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ اس انکشاف سے اس کو رنج ہوا کہ اس کی عدم موجودگی میں قفل توڑ کر یہاں کوئی چور آ گیا تھا۔ بہر نوع تفتیش کے طور پر وہ بولا۔

"بھوری مجھے کسی واقعہ کا علم نہیں۔ تمہاری سوتیلی اماں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا ہے۔ ابھی تم کہہ رہی تھیں کہ اگر وہ ذکر نہ کرتیں تب بھی تم کوئی واقعہ مجھے سنائے بغیر نہ رہتیں۔ اس لئے میں تم ہی سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہوا؟"

بھوری کو فوراً یقین آ گیا کہ اُس واقعہ کو اُس کی ماں نے ضرور حفیظ سے چھپایا ہے۔ چنانچہ فوراً بولی: "آپ سے کچھ نہیں کہا اماں نے؟ اچھا تو مجھ سے سنئے۔ جب آپ تین چار روز تک نہ آئے تو اماں نے کسی کو میرے لئے پھانس لیا۔ میں سخت بگڑی۔ مگر وہ نہ مانیں آخر میں نے دھمکی دی کہ اگر انہوں نے زبردستی کی تو میں شور مچا کر محلہ والوں کو جمع کر لوں گی۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ ترکیب کامیاب ہوئی اور میں اُس رات بچ گئی۔" یہ کہہ کر داد طلب نظروں سے حفیظ کو دیکھنے لگی۔

بھوری کے بیان کو سنتے ہی حفیظ کے دل کا دروازہ کھل گیا۔ اس

کی اب تک یہ کیفیت تھی جیسی مالی یا چوکیدار کی ہوتی ہے۔ وہ مشین کی طرح اپنے زیرِ نگرانی باغ یا عمارت کی اب تک صرف حفاظت میں لگا ہوا تھا۔ خود نہ تو اپنی تحویل کی چیزوں سے لطف لے رہا تھا نہ نظر پسندیدگی دیکھنے کی فرصت پا رہا تھا۔ لیکن آج جب خوشنما باغیچہ نے خود بڑھ کر اپنی دلکشی کا اس کے سامنے اعلان کیا تو اس کا دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ وہ دیوانہ وار اُٹھ کھڑا ہوا اور مجنونانہ محبت سے بھوری کے دونوں شانے تھام کر بولا۔

"بھوری تم بہت ہی پیاری لڑکی ہو۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اس قدر اچھی ہو۔" اس کے بعد اس سے نہ بولا گیا۔ چند منٹ بعد اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی بہن شمیم کا نقشہ آنے لگا۔ اس نے بھی ایک درندے کے چنگل میں پھنس کر اپنے کو بچایا تھا۔ بھوری کا پیرہن اگرچہ ثابت نہ رہا تھا۔ مگر وہ نہایت مصمم ارادہ کے ساتھ اس کی سوزن کاری کر رہی تھی۔ یہاں بھوری کا کردار شمیم کے کردار سے مختلف ہو کر بڑھ گیا تھا۔

"بھوری تم نے اپنے آپ کو بچانا کیوں پسند کیا؟" آخر حفیظ نے بے خودی میں دریافت کیا۔

"کیونکہ اب میں آپ کی امانت ہوں۔" بھوری نے سرشار ہوکر اس کے شانے پر سر رکھ کر جواب دیا۔

"میری امانت؟" حفیظ نے گمشدگی کے عالم میں کہا: "اس شخص کی امانت جو اب تک اپنی ذات تک کا امین نہیں بن سکا ہے۔ شاید اس دنیا کے تمام لوگ بھوری کی ماں، اس کے باپ اور پان شاپ والے کی طرح نہیں ہیں۔"

پان شاپ والے کا خیال آتے ہی وہ نفرت و غصہ سے تھرا اٹھا۔

آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میری سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آرہی ہیں" بھوری نے کہا۔

"میں خود بھی ان کو نہیں سمجھ رہا ہوں۔" حفیظ نے اس کو بازوؤں میں لے کر کہا۔

ایک کُند طبیعت پر یہ پہلی صیقل تھی۔ مگر ابھی تک زنگ آلود کرنے والی بے شمار چیزیں تھیں۔ کہا نہیں جاسکتا کہ یہ صیقل ہمیشہ کامیاب ہوتی رہیگی"۔

(۱۲)

شمیم نے جو کچھ خط میں اپنے بھائی حفیظ کو لکھا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔ شروع میں جب وہ رضا کے بچوں کو پڑھاتی تھی تو اس نے اکثر رضا کو اپنی جانب پُر اشتیاق نظروں سے نگراں پایا تھا۔ عورت ستائش بھری نظروں کا بُرا کیسے مان سکتی ہے۔ شمیم بھی چپ رہی۔ لیکن جب رضا نظروں کے پیام میں ناکام رہا تو وہ عملی اقدامات کی طرف اتر آیا۔ شمیم اس کی تاب نہ لا سکی اور بگڑ گئی۔

اس کے اس غصّہ کو رضا کی بیوی نے دوسرا رنگ دیا اور اس نے مشہور کر دیا کہ شمیم اس کے شوہر پر ڈاکہ ڈال رہی ہے اور اس کو اچھی

طرح بدنام کر کے اور اپنے شوہر سے لڑ لڑا کر وہ میکے چلی گئی۔ رضا نے شمیم کی معصومیت سے متاثر ہو کر علی الاعلان اپنی غلطی کا اعتراف کر کے شمیم کی بے گناہی ثابت کر دی۔ اس طرح شمیم کی عزت بحال ہو گئی۔ مگر رضا باوجود شادی شدہ ہونے اور دو بچوں کا باپ ہونے کے شمیم پر بری طرح مٹا ہوا تھا۔ دردِ محبت کے مزے لینا تو اس نے درد سری سمجھا۔ اس لئے ایک لمحۂ وصل کے لئے بیقرار ہو گیا۔

اس واقعہ کے ایک ماہ بعد رضا کی بیوی اپنے میکے میں نمونیہ کی شکار ہو گئی اور ایک ہفتہ بیمار رہ کر چل بسی۔ رضا بچوں کی وجہ سے چند روز تک تو سخت پریشان رہا۔ اس کے بعد اسے پھر شمیم کے کنارِ تعیش کی آرزو نے آدبایا۔ روز تدبیریں سوچتا کہ کس طرح اس کو بلائے یا اس کے پاس پہنچے۔

آخر اس نے ایک بہت چلتی ہوئی عورت کی خدمات حاصل کیں اور پرانی ترکیبوں سے وہ اس نئی لڑکی کو اپنے کمرے میں بلانے میں کامیاب ہو گیا شمیم دھوکا کھا کر یہاں آ پھنسی تھی اور رضا کی صورت دیکھتے ہی اس کا ننھا سا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ قلعہ کی طرح مکان تھا۔ جس میں سے نکل بھاگنا بھی ممکن نہ تھا۔ جس کمرے میں اس نے اپنے کو رضا کے ساتھ پایا وہ اتنا محفوظ

تھا کہ اگر وہ شور بھی مچاتی تو اس کی آواز کوئی نہ سن سکتا۔ اِن تمام باتوں کو سامنے رکھ کر وہ خوف سے کانپنے لگی اور رضا کو اِس طرح دیکھنے لگی جس طرح بکری شیر کو دیکھتی ہے۔

"یہ کیا حرکت ہے رضا صاحب آپ کی کہ مجھے دھوکا دیکر اس طرح یہاں بلا لیا۔" آخر شمیم نے بمشکل اپنے خوف پر قابو پا کر پوچھا۔ رضا ہنسنے لگا اور صوفے پر پیر دراز کر کے لیٹ گیا۔

"بیٹھو شمیم۔ ڈرو نہیں۔ مَیں بھوت نہیں ہوں کہ تمہیں جھپٹ جاؤں گا۔" رضا نے کہا۔

"آپ بھوت سے بھی بدتر ہیں کہ ایک شریف لڑکی کو پریشان کر رہے ہیں۔" شمیم نے غصّہ سے کہا۔

"نہیں جانِ آرزو میں تمہیں پریشان نہیں کر رہا۔ بلکہ چاہتا ہوں کہ اس خالی مکان کی ملکہ اب تم بنو۔ لیکن ملکہ بننے سے پہلے تم ایک دفعہ میری آغوشِ اشتیاق میں آؤ۔ شمیم مَیں تم پر جان دیتا ہوں۔ تمہاری بے گناہی اور اپنی خطا کا مجھے ہمیشہ اعتراف رہے گا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ تمہارے اندر اس بلا کی جنسی کشش ہے کہ آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔ رضا نے کہا اور وہ اُٹھ بیٹھا

"آپ کمینگی کی حد تک بدتمیز ہیں۔" شمیم نے اسی قدر غصہ سے کہا۔
"شاید اس سے بھی زیادہ۔ لیکن تم بھی تو ساحرہ ہو کہ انسان کو بالکل بے قابو کر دیتی ہو۔ اُف یہ تمہارا قیامت کا بدن، یہ بلا کا نکھار، یہ آفت کا حُسن۔ شمیم اگر تم میری جگہ ہوتیں اور مَیں تمہاری جگہ، تو اس وقت مرد کی حیثیت سے تم ایسی ہی دیوانی ہو جاتیں جس طرح اس وقت تم کو دیکھ کر میں ہو رہا ہوں۔"
"مجھے جانے دو۔ مَیں تمہاری بکواس کو برداشت نہیں کر سکتی۔"!
"تمہیں جانے کی اجازت دینا اس وقت میرے بس میں نہیں ہے مَیں تم پر اس بُری طرح مٹا ہوا ہوں کہ درندے کی طرح تم سے لپٹ جانے کو بیقرار ہوں۔ مَیں تمہیں نہیں چھوڑوں گا شمیم۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مَیں آدمی نام کو نہیں رہا ہوں بلکہ صرف درندہ ہوں۔ ہر مرد درندہ ہے جب اس کے سامنے تم جیسا مرغوب شکار آجاتا ہے تو وہ اور بھی خونخوار ہو جاتا ہے۔"
رضا نے کہا۔ اسفل احساسات کی وجہ سے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا۔ آنکھوں کی پتلیاں سکڑ گئیں اور اُن سے بہیمانہ آگ برسنے لگی۔ وہ دیوانہ وار کھڑا ہو گیا اور شمیم کی طرف جھپٹا۔ مگر وہ ایک بڑی میز کو درمیان میں لے آئی۔
رضا کے تیور اور بہیمیت کو دیکھ کر شمیم خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔

اپنی بے بسی اور رضا کے اصرار و قدرت کے تصوّر سے اس کا دل ڈوبنے لگا بچنا محال نظر آرہا تھا۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھنا چاہا۔ شاید مدد کیلئے، لیکن درمیان میں بہت موٹی چھت حائل تھی۔ اور اگر چھت نہ بھی ہوتی تو قدرت ایسے تماشے روز دیکھا کرتی ہے۔ اور ٹس سے مس نہیں ہوتی۔

رضا نے میز پر چڑھ کر اس کو پکڑنا چاہا مگر وہ جسمِ لطیف کی طرح نکل گئی اور غصہ سے رضا کو گلدان کھینچ مارا لیکن وار خالی گیا۔

"میری جان! میں اس وقت دلیل کی حد سے بہت دُور ہوں۔ تمہیں سمجھا نہیں سکتا اِس لئے ضد نہ کرو میرے دل کی راحت" رضا نے اس کی طرف آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے کہا۔ شمیم کو کوئی مفر نظر نہیں آرہا تھا۔ اس خیال سے کہ آج اس کی آبرو لُٹی وہ کپکپا اُٹھی۔

مدافعت کے لئے اسے کوئی چیز بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ ناگاہ اُس کی نظر الماری کے اُوپر پڑی جس پر ایک پستول رکھا ہوا تھا۔ رضا کی آنکھیں شمیم پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کو کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ جان سے زیادہ عزیز آبرو کی خاطر خطرہ مول لے کر شمیم ایک بار بجلی کی طرح میز کے پیچھے سے نکلی اور لپک کر پستول لے لیا۔ شمیم کو آزاد دیکھ کر رضا بھی لپکا اور اُس نے اسے

جالیا۔ لیکن شمیم نے پستول اس کی طرف بڑھا کر سختی سے کہا۔" دور رہو ورنہ قسم ہے مار ڈالوں گی اور غصہ سے اس کا ہاتھ کانپنے لگا۔ رضا نے اپنے سامنے پستول کی نالی دیکھی تو وہ بلا خوف کھائے ویسے ہی چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

" مار ڈالو۔ مَیں تمہارا ہی ہوں مار ڈالو مجھے میری اپنی شمیم" رضا نے دیوانگی کی سنسنی سے کہا اور اس کی طرف بڑھنے لگا۔

" مَیں سچ کہتی ہوں —— خدا کی قسم پستول چلادوں گی ... اگر ایک قدم بھی آگے بڑھایا۔" شمیم نے اسی قدر غیظ سے کہا۔

لیکن میری جان! تمہارا پیارا پیارا ہاتھ تو بری طرح کانپ رہا ہے خطرہ ہے کہ نشانہ خطا کر جائے۔ ذرا ہاتھ کو قابو میں کرو اور اچھی طرح شست باندھ کر پستول چلاؤ۔" رضا نے حصولِ مقصد کی پوری دیوانگی کے ساتھ کہا۔ شمیم اس کے اس عزم راسخ سے کانپ اٹھی۔ ارے اس ظالم کو اپنی جان بھی عزیز نہیں۔ رضا نے بالآخر ایک قدم اس کی طرف اُٹھایا۔

" خبردار۔ اب ایک قدم بھی نہ اُٹھے۔ شمیم نے کپکپاتی آواز سے کہا۔ پستول والا ہاتھ بری طرح لرز رہا تھا۔ رضا نے کچھ نہیں سنا۔ وہ سینہ تانے

بازو پھیلائے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ایک فیر کر دیا تو اپنی سراسیمگی اور دل کی شدید دھڑکن کے دورے میں شمیم نے اپنے صیاد کو فرش پر دراز دیکھنے کی آرزو میں جو نظر اُٹھائی تو رضا بدستور پوری درندگی کے ساتھ کھڑا تھا۔ گولی اس کی پیشانی کو چھوتی ہوئی نکل گئی تھی۔ تمام چہرہ لہولہان ہو جانے کی وجہ سے اس وقت وہ اور بھی خونخوار درندہ معلوم ہو رہا تھا۔

"پھر کوشش کرو میری شمیم۔ پھر کوشش کرو۔ نشانہ صحیح نہیں بیٹھا" رضا نے مسکرا کر کہا اور پھر اس کی طرف چلا۔ شمیم نے پھر فیر کیا۔ نہ دل قابو میں تھا اور نہ ہاتھ پیر۔ یہ فیر بھی خالی گیا۔ رضا تن کر کھڑا ہو گیا۔ اور ہنستا ہوا بولا "اتنے بڑے ڈیل ڈول کے آدمی پر تم نشانہ نہیں جما سکتی ہو۔ لو میں اب بالکل تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ پھر چلاؤ گولی۔

شمیم کا ہاتھ رک گیا۔ کیونکہ اب وہ اس کی طرف بڑھ نہیں رہا تھا۔

"تم میری طرف آئے اور میں نے تیسرا فیر کیا" شمیم نے کہا۔

"یہ لو۔" رضا نے کہا۔ اور اس کی طرف بڑھا۔ تیسرا فیر ہوا اور وہ بھی خالی گیا۔ شمیم نے مایوس ہو کر پستول ڈال دیا اور اس طرح بے بسی کے عالم میں

کھڑی ہو گئی جیسے کہہ رہی ہو "آجاؤ اب میں تمہارے بس میں ہوں۔"

"شمیم پستول زمین پر نہ ڈالو ابھی اِس میں دو گولیاں اور ہیں فراغت کرو، اپنے ہاتھ کو روکو اور اچھی طرح نشانہ باندھو" رضا نے کہا شمیم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ شخص موت کے منہ پر تھپڑ دیتا ہوا اپنے مقصد کی طرف آخر کیوں بڑھ رہا ہے۔ کیا اس کو اپنا مقصد اس قدر عزیز ہے۔ کہیں رضا کو اس سے اندھی اور شدید محبّت تو نہیں۔

"شمیم سوچ کیا رہی ہو۔ ابھی پستول میں دو گولیاں اور ہیں" رضا نے پھر کہا "اگر تم نے پھر مجھے قتل کرنے کو فیر نہیں کیا تو میں آتا ہوں۔ اس کے جواب میں شمیم اس کی طرف حقارت سے دیکھ کر میز کے درمیان سے نکل گئی اور دور جا کھڑی ہوئی۔ رضا اب باسانی اس کو پکڑ سکتا تھا۔ وہ اس ارادے سے چند قدم بڑھا بھی، موت کا اب خطرہ نہ رہا تھا کیونکہ شمیم پستول پھینک چکی تھی۔ مگر وہ نہتی ہو کر اس وقت کس قدر بارعب و پروقار نظر آنے لگی تھی۔

رضا کے جیسے کسی نے پیر پکڑ لئے۔ آہستہ آہستہ اس کو خیال آیا کہ یہ لڑکی اس سے کس قدر نفرت کرتی ہے اور وہ کتنی پاک دامن ہے یہ دونوں

خیال اتنے وزنی تھے کہ رضا کی ہمت ایک دم سرد پڑ گئی۔ اس کے پیر کپکپا اُٹھے اور سر جھکا کر وہ ایک طرف مڑ گیا۔ اس کے مڑتے ہی شمیم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ اب کیوں نہیں آگے بڑھ رہا تھا۔ نفرت و غصہ کے شعلے اور حقارت کا دھواں ہلکا ہونے لگا اور اس گرمی کے مٹتے ہی اس کو بھی خیال آیا کہ رضا کس قدر زندگی کے ساتھ اس کو چاہتا ہے، موت سے بھی نہ ڈرا، وہ تو میرے لرزتے ہاتھ نے ساتھ نہ دیا۔ ورنہ اس کو مار ڈالنے میں میں نے کیا کسر چھوڑی تھی۔ وہ اپنے مقصد میں کس قدر شدید ہے۔ کتنے اندھے پن سے میرے لئے بے قرار ہے۔ تین گولیاں بھی اس کو نہ روک سکیں۔ ظالم پستول کی نالی پہ چڑھ کر بھی مجھ تک پہنچنے سے نہ چوکا۔ مگر یہ دفعتہً اس کو کیا ہو گیا ہے۔ اب تو میں بالکل بے بس اور نہتی کھڑی ہوں۔ اب کیوں نہیں بڑھتا ہے وہ۔

شمیم نے پھر رضا کی طرف دیکھا جو سر جھکائے کونے میں کھڑا تھا۔ اس کی پیشانی پر سے خون بہہ رہا تھا جس کو روکنے کی اس نے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

ایک دو منٹ کے بعد آخر اس نے رضا کی آواز سنی۔

"شمیم میں نے دروازہ کھول دیا ہے۔ جاؤ پاکدامن لڑکی۔"

شمیم نے دروازہ کھلا ہوا دیکھا۔ چند منٹ پہلے اگر وہ نکل بھاگنے کے لئے ایک سوراخ بھی دیکھتی تو اس کی طرف لپکتی۔ لیکن اب وہ بڑے اطمینان سے دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی جیسے اس کو اب کوئی خطرہ نہ تھا اور وہ ہر طرف سے مطمئن تھی۔

جب وہ دروازے میں سے نکلنے لگی تو رضا نے قریب آکر ہچکچاتے ہوئے کہا "اس ماحول میں معافی کے الفاظ زبان پر لانا ان کو گندہ کرنا ہے۔ میں تو شاید کبھی بھی تم سے معافی مانگنے کی اب جرأت نہیں کر سکتا لیکن تم ہی کبھی اپنی پاک اور پیاری فطرت کی بنا پر مجھے معاف کر دینا تو میں سمجھوں گا کہ جنت مل گئی۔"

یہ کہہ کر اس نے دروازہ اچھی طرح کھول دیا اور شمیم چلی گئی۔

(۱۳)

حفیظ اب بھوری پر فراخدلی سے روپیہ صرف کر رہا تھا۔ چند روز پہلے صرف نگرانی کا جذبہ اس پر روپیہ صرف کرا رہا تھا اور اب محبّت آ کودی تھی جو بلا اندیشۂ سود و زیاں اور بغیر فکرِ فردا کے انسان کو نامعلوم کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔

بھوری کی ماں نے دیکھا کہ حفیظ بھوری پر اس طرح بے دریغ خرچ کر رہا ہے تو اس کی حرص اور بڑھی اور اس نے بھوری کی فیس زیادہ کر دی ابھی حفیظ کے پاس روپیہ تھا۔ چنانچہ اس نے زیادہ خیال نہیں کیا۔ گھٹتا گیا۔

جب پیسے ختم ہونے لگے اور بھوری کی ماں کے تقاضے بڑھنے لگے تو حفیظ کو پھر روپے کی فکر ہوئی۔ اسے خیال آیا۔ کیوں نہ مستقل طور پہ بھوری کو اپنا بنا لے۔ جب وہ اس کی بیوی ہو جائیگی تو اس طرح محض نگرانی کی خاطر اس کو اندھے پن سے روپیہ خرچ کرنے بلکہ سب سے زیادہ تکلیف دہ روپیہ فراہم کرنے کی مہم سے نجات مل جائے گی۔ کچھ پاس ہوا تو میاں بیوی نے مل جل کر کھا پی لیا۔ کچھ نہ ہوا تو تنگی سے گذارا کرتے رہے۔ ازدواج سے یہی تو فائدہ ہے کہ زندگی کے دن گزارنے کے بیقاعدہ طریقوں میں ایک بے قاعدگی پیدا ہو جاتی ہے۔

حفیظ کے تاریک دل میں یہ معقول اور نیک خیال آیا تھا خیال کی معقولیت میں شبہ نہیں۔ مگر جن ذرائع سے وہ اپنی اس اسکیم کو بروئے کار لا رہا تھا وہ جرم و گناہ کی آمیزش سے خالی نہ تھی۔ اس نے بھوری کو اس طرح بچایا تھا جیسے کوئی شخص ڈوبتے ہوئے انسان کو اس طرح بچائے کہ خود ڈوبنے کے لئے اپنے پیروں میں وزن باندھ لے۔ ایک بے آئین دماغ کے اصول تھے۔ جن میں برائیاں اور بھلائیاں ملی جلی تھیں۔ بلکہ برائیوں کا پلڑا بھاری تھا۔

اب بھوری کی فیس کے لئے حفیظ نے اِدھر اُدھر ڈاکے مارنے شروع کئے۔ کبھی جیبیں کتریں، کبھی چوری کی، کبھی استحصال بالجبر سے کام لیا اور روپے کا بندوبست کر کے بھوری کی ماں کو رقم دی تاکہ بھوری مزید تاخت سے بچی رہے۔ اس کی کیفیت ایسی تھی جیسے کسی جانور پر رحم کھا کر شیر نے اس کو صرف اس وجہ سے اپنی حفاظت میں لے لیا ہو کہ وہ اس کی جان لینا گناہ سمجھتا تھا۔ مگر اس کی پرورش کے لئے دوسرے جانوروں کو مار کر ان کا گوشت اپنے زیرِ حفاظت جانور کے سامنے لا رہا تھا۔ یہ ایک جانور کی سی ہمدردی تھی جس میں جو اس کے ذریعہ نیک کام کی تمیز صرف اتنی کی گئی تھی کہ سامنے آ جانے والے پہلے جانور پر ترس کھا لیا گیا تھا۔ اور اس کی پرورش میں جو دوسروں کی جانیں وہ لے رہا تھا۔ یہ جرم انسانی سمجھ تک پہنچنے کے بعد اس کی عقل میں آ سکتا تھا۔

"یہ روپیہ حفیظ تم کہاں سے لاتے ہو؟" آخر ایک رات بھوری نے اس سے پوچھا۔

"تمہیں اس کی کیا فکر ہے بھوری۔" حفیظ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ تم اب میری بُری بھلی زندگی کے مالک ہو۔" بھوری نے جواب دیا۔

"پھر تم اپنے مالک سے کیوں سوال کرتی ہو؟" حفیظ نے کہا۔

بھوری چپ ہو گئی لیکن پھر بولی۔ "اپنے مالک پر بھی تو نوکر کا کچھ حق ہوتا ہے۔"

"بہت کچھ۔ لیکن بھوری تمہیں بیکار باتوں کے لئے پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ مَیں ارادہ کر چکا ہوں کہ تم سے بہت جلد شادی کر لوں۔ تمہیں کوئی عذر تو نہیں ہے بھوری؟" حفیظ نے پوچھا۔ زمانے کی ستائی ہوئی غریب بھوری نے فرطِ مسرّت سے اس کی گود میں سر ڈال دیا۔

"جواب دو نا بھوری؟"

"میری یہ قسمت کہاں۔" اُس نے اُسی وفورِ مسرّت سے کہا۔

"مَیں بناؤں گا تمہاری قسمت۔ پہلے ذرا وطن ہو آؤں۔ ایک ہفتے میں لوٹ آؤں گا۔ اماں اور شمیم کو دیکھے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں بس وہاں سے واپسی میں تھوڑے سے روپے کا انتظام کر کے ہمیشہ کے لئے تم کو اپنا بنا لونگا۔ پھر نہ تو مجھے بے فائدہ تمہاری نیس ادا کرنے کی ضرورت رہے گی

اور نہ تم اپنی سوتیلی ماں کی خاطر اس جھنجھٹ میں پھنسی رہو گی۔

وطن جانے سے حفیظ کا پہلا مقصد تو یہی تھا کہ اپنی ماں اور بہن سے مل آئے لیکن وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ رضا کو بھی ایسی سزا دے کہ وہ آئندہ اس کی بہن کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ کرے۔ شمیم اُس روز دھوکے سے رضا کے ہاں جا پھنسی تھی۔ وہاں سے آنے کے بعد اس کو دن بھر رضا پر سخت غصہ آتا رہا۔ چنانچہ اس نے اُسی روز تمام واقعہ اپنے بھائی حفیظ کو لکھ بھیجا تھا۔ لیکن دوسرے روز جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اسے افسوس ہوا کہ کیوں اس نے رضا کی برائی کی۔

شمیم کے خط کو پڑھ کر حفیظ غیظ سے دیوانہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ تیسرے دن بھوری کی ماں کو ایک ہفتہ کی پیشگی فیس ادا کر کے وہ وطن روانہ ہو گیا۔ اُس کو دیکھ کر اس کی ماں تو بہت ہی خوش ہوئی لیکن شمیم شرم کی وجہ سے اس کے سامنے نہ آئی۔ حفیظ اس بات کو سمجھ گیا۔ چنانچہ اس نے اپنی بہن پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی جیسے اُس کو اس کا دوسرا خط ملا ہی نہیں اس نے کہا:۔

"بھئی شمیم تم بہت ہی سست لڑکی ہو۔ کبھی کبھار تو خط بھیج دیا کرو۔

وطن چھوڑنے کے بعد مجھے تمہاری فقط ایک چھٹی ملی تھی۔ وہ بھی امی کے خط کے بعد۔" شمیم کو تعجب ہوا کہ اسے پچھلے ہفتہ کا بھیجا ہوا خط کیوں نہیں ملا۔ اس کے نہ ملنے کی اس وقت اس کو بڑی خوشی ہوئی کہ وہ شرمناک واقعہ اُس کے بھائی کے علم میں شکر ہے نہیں آیا۔ اور رضا کی جانب سے وہ اب مطمئن ہو گیا۔ اس خط کی پیدا کی ہوئی شرم بھی جاتی رہی۔ چنانچہ مسرت کو ضبط کرتی ہوئی بولی۔

"واہ بھائی جان میں نے تو اگلے ہفتے ہی آپ کو ایک خط لکھا تھا۔"

"اچھا! بھئی سچ کہتا ہوں مجھے تو نہیں ملا تعجب ہے کہاں چلا گیا"۔ حفیظ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"حیرت ہے" شمیم نے کہا۔

"کیا لکھا تھا تم نے اس میں آخر؟ کوئی ضروری بات تھی؟" حفیظ نے پوچھا۔

"نہیں تو — کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بس خیر و عافیت کے سوا کچھ نہ تھا۔" شمیم نے کہا اور جھوٹ بولنے سے اس کے حسین نقش و نگار میلے ہو گئے حفیظ دل میں سخت متحیر ہوا کہ وہ جھوٹ کیوں بول رہی ہے، حقیقت کیوں

چھپا رہی ہے اور لعین رضا کی کمینہ حرکت پر پردہ کیوں ڈال رہی ہے۔

لیکن حفیظ نے ٹھان لی تھی کہ وہ رضا سے بدلہ لے گا اور شمیم ہی کے سامنے تاکہ اس کا بھی کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ شرم کی وجہ سے یہ بیوقوف لڑکی اس واقعہ کو چھپا رہی ہے۔

دوسرے روز حفیظ نے رضا کو چائے پر مدعو کیا۔ اس دعوت پر رضا بہت حیران ہوا۔ کس منہ سے وہ اُس گھر میں قدم رکھ سکتا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ شمیم نے تمام واقعہ کی اطلاع اپنے بھائی کو کر دی ہوگی۔ مگر اس کے جواب میں بجائے قہر کے حفیظ مہر کا مظاہرہ کیوں کر رہا ہے۔ بڑا نیک لڑکا ہے میں اس کے سامنے اس کی پاکدامن بہن کے قدموں میں گر کر معافی مانگ لونگا۔ یہ سوچ کر رضا شام کو حفیظ کے ہاں چائے پر آ گیا۔

کمرے میں صرف حفیظ اور اس کی ماں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ شمیم دوسرے کمرے میں تھی۔ رضا جب داخل ہوا تو ملامتِ ضمیر اور ندامت سے اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اُس کے قدم نہیں اُٹھ رہے تھے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ چائے کا ایک گھونٹ حلق میں ڈالنے سے پہلے ہی وہ شمیم کے بھائی سے اپنے جرم کی معافی مانگ لے ورنہ جب تک وہ یہاں رہے گا شرم و ندامت سے

اس کی آنکھیں نہ اُٹھ سکیں گی۔

یہ سوچ کر رضا مصافحہ کے لئے حفیظ کی طرف بڑھا۔ اس کو دیکھتے ہی حفیظ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ رضا کی پیشانی پر اب بھی پھاہا لگا ہوا تھا۔ حفیظ نے اس کو ذلیل کرنے کے خیال سے پوچھا۔ کہئے رضا صاحب یہ پیشانی پر کیا ہوا؟"

"چوٹ لگ گئی تھی بھائی حفیظ۔" رضا نے دھیمی آواز سے کہا۔

"کس طرح؟" حفیظ نے نفرت سے مسکرا کر پوچھا۔

"حادثہ ہو گیا تھا ایک۔" رضا نے خائفانہ اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"گولی کا؟" حفیظ نے اُسی طرح اُس کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔ رضا سراسیمہ ہو کر چپ ہو گیا۔

"گولی کا ہوا تھا نا حادثہ؟" اس بار حفیظ نے گرج کر پوچھا پھر غصہ سے کپکپاتا ہوا بولا "تو لے یہ دوسرا حادثہ سنبھال۔" اس کے بعد اُس نے رضا کے منہ پر زور سے مُکا رسید کیا جس سے وہ تیورا کر فرش پر گر پڑا۔

"بے غیرت، ذلیل یہاں تو کس منہ سے آیا۔ حفیظ نے زور سے اس کے ایک لات مارتے ہوئے کہا۔ حفیظ کی ماں کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہوا

کیونکہ وہ تمام معاملہ سے یکسر بے خبر تھیں۔ اُنھوں نے دور سے ایک چیخ ماری اور بولیں۔

"حفیظ ــ حفیظ۔ یہ کیا کرتا ہے، دیوانہ تو نہیں ہو گیا ہے۔"

"یہ کیا حرکت ہے بھائی جان! آپ تو کہہ رہے تھے کہ آپ کو میرا خط نہیں ملا۔" شمیم نے تیزی سے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

"یہ تمہارے خط کا ہی جواب ہے شمیم۔ اور ابھی تو مجھے کئی جواب دینے ہیں۔" حفیظ نے کہا اور رضا کو کچلنے کے لئے بڑھا۔

"بس بھائی جان!" شمیم نے رضا پر جھکتے ہوئے کہا اور اپنے ڈوپٹے سے اس کے چہرے کا خون صاف کرنے لگی۔

"رضا صاحب ہمارے مہمان ہیں اور مہمان کے ساتھ اس طرح پیش نہیں آتے ہیں۔" شمیم نے کہا۔

"حور صفت شمیم میرے ناپاک خون سے اپنے مقدس آنچل کو ملوث نہ کرو۔ میں اس سے بدتر سزا کا مستحق ہوں۔ بھائی حفیظ میں تعزیر کا منتظر ہوں۔" رضا نے بدقت کھڑے ہو کر کہا۔ مگر حفیظ پہلے ہی شمیم کے طرزِ عمل سے سکتہ میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کا تو خیال تھا کہ شمیم اپنے توہین کنندہ سے انتقام لینے میں بڑی خوشی سے اس

کی مدد کرے گی مگر وہ تو اس کو پکار رہی تھی۔

"بھوری ——— ہر طرف بھوری!" حفیظ کی زبان سے نکلا اور وہ دیوانہ وار کمرے سے چلا گیا۔ شمیم محبّت سے رضا کا خون صاف کرتی رہی۔ اے انسان خدا کرے تیری رگوں میں ہمیشہ سرخ خون گردش کرتا رہے۔ وہ کبھی پانی نہ بنے ——— وہ کبھی سفید نہ ہو!

(۱۴)

حفیظ دوسرے ہی روز وطن سے چل دیا۔ اور اپنی بھوری کے پاس آ پہنچا۔ اس کے دل کو آسودگی ہمیشہ بھوری ہی کے دامن میں ملتی تھی۔ دو تین روز تک وہ بہت مضمحل و افسردہ رہا۔ اس کی سمجھ میں رضا کے ساتھ اپنی بہن کا طرزِ عمل نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا عورت اپنے غارت گر مرد کو معاف کر دیا کرتی ہے۔ آخر اس نے بھوری ہی سے دریافت کیا۔

”بھوری میں تم سے ایک سوال کرتا ہوں۔ تم کو زبردستی جب اس فضا

میں دھکیلا گیا تھا تو کیا تم نے اپنے پہلے ڈاکو سے نفرت نہیں کی تھی؟"

"سخت نفرت۔ میں اب بھی اس کے نام پر تھوکتی ہوں" بھوری نے صاف دلی سے کہا۔ پھر شمیم نے رضا کو کیسے معاف کر دیا حفیظ نے دل میں حیرت کرتے ہوئے سوچا۔ مگر جلد اس کی سمجھ میں آگیا کہ رضا کو اپنے گندے مقصد میں شمیم نے آج تک کامیاب نہیں ہونے دیا ہے بیشک اس نے چند بار سفیہانہ اقدامات کی کوشش ضرور کی تھی۔ مگر بہادر شمیم نے ہر بار اس کو زک دی نہ صرف یہ بلکہ اس کو مار ڈالنے تک سے دریغ نہ کیا۔ لیکن اس تمام تنفر کے باوجود شمیم میں جو دفعتہً تغیر پیدا ہو گیا تھا وہ حفیظ کی سمجھ میں نہ آیا۔

میں رضا کو قتل کر ڈالوں گا۔ حفیظ نے دل میں سوچا اور سو جانا چاہا مگر پیسے ختم ہو گئے تھے اس لیے آج رات کو وہ پھر کہیں چوری کرنے یا ڈاکہ ڈالنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ بارہ بجے آخر وہ چپکے سے اُٹھا اور کوٹھڑی سے نکلنے لگا دفعتہً بھوری کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اُٹھ بیٹھی اور خواب آلود نظروں سے اس کو دیکھتی ہوئی بولی۔

"کہاں چلے حفیظ؟"

"ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تم سو جاؤ۔" حفیظ نے آہستہ سے کہا۔

"یہ تمہارے تھیلے میں کیا ہے"؟ اس نے حفیظ کے ہاتھ سے تھیلا چھین کر پوچھا۔

"ارے کنجیوں کے اتنے سارے گچھے! اور یہ اوزار کیا ہیں؟" بھوری نے تھیلے والی چیزوں کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔

"کچھ نہیں ہے بھوری سو جاؤ۔ یہ میرے ایک دوست کا سامان ہے دینے جا رہا ہوں اسے۔" حفیظ نے زبردستی تھیلا اُس کے ہاتھ سے لے کر کہا۔

"میں اس وقت تمہیں مکان سے نہ نکلنے دوں گی۔ یہ اوزار اور یہ کنجیاں تو مجھے خطرناک معلوم ہوتی ہیں۔ سچ بتاؤ حفیظ تم کیا کرتے ہو ان سے؟"

"پاگل لڑکی تجھے اس سے کیا۔ یہی چیزیں تجھے مجھ سے باندھے ہوئے ہیں۔ انہیں کے ذریعہ تیری ماں فیس پاتی ہے۔ انہی سے غیر مردوں کو تیرے پاس آنے سے روکتا ہوں۔" حفیظ نے زہر خند سے کہا۔ بھوری سوچ میں پڑ گئی کس طرح حفیظ اِن چیزوں سے اس کی حفاظت میں مدد لیتا ہے۔ اس نے

حیرانی سے دل میں کہا۔ دفعتہً اس کو ایک خیال آیا جس کی انتہائی نفی کرنے کے باوجود وہ پریشان ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

"حفیظ —— اچھے" کیا تم چوریاں کرتے ہو؟" جسمانی طور پر بگڑی ہوئی مگر روحانی طور پر سنبھلی ہوئی بھوری نے پوچھا۔ اس سوال سے حفیظ چونک پڑا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور دروازے سے نکل جانا چاہا مگر بھوری اس سے لپٹ گئی۔

"میں تمہیں نہیں جانے دونگی حفیظ۔ تم چاہے کوئی ہو، ڈاکو ہو یا بھوت" میرے محسن ہو۔" اُس نے کہا۔

"ہٹ جاؤ بھوری میرا راستہ نہ روکو۔" حفیظ نے اس کو دھکا دے کر کہا۔ مگر بھوری نے اس کو نہ چھوڑا۔

"حفیظ چوری بہت بری چیز ہے۔" بھوری نے محبت کی اپیل سے کہا "لیکن وہ تمہارے پیشے سے شاید بُری نہیں ہے۔" حفیظ نے غصہ سے سے کہا۔ بھوری کے چوٹ سی لگی لیکن پھر سنبھل کر بولی:-

"مگر میرا پیشہ تو تم نے چھڑا دیا۔ میں بھی تمہارا پیشہ تم سے ترک کراؤنگی۔"

"بیوقوف۔ مجھ سے میرا پیشہ ترک کرائیگی تو یاد رکھ تیرا پیشہ پھر زندہ

ہو جائیگا۔" حفیظ نے کہا۔

"اب وہ کبھی زندہ نہ ہو گا۔ کیونکہ اسے نیست و نابود کرنے والا مجھے مل گیا ہے۔" بھوری نے اس کی گردن میں ہاتھ حمائل کر کے کہا۔ حفیظ چپ ہو گیا چند لمحے بعد بولا۔

"ارے پگلی۔ اس میرے پیشے سے نہ صرف تو مزید لٹنے سے بچی ہوئی ہے بلکہ ایک دوسری لڑکی کی عزّت کی حفاظت بھی اس سے ہو رہی ہے۔ اور وہ لڑکی میری بہن ہی ہے۔"

"خدا ان کو بھی میری طرح کوئی محافظ بخش دے گا۔" بھوری نے کہا۔

محافظ! یہ لفظ ایکدم حفیظ کے دماغ سے ٹکرایا۔ محافظ۔ شاید شمیم کو اپنا محافظ مل چکا ہے۔ اُس نے مار مار کر اپنے درندے کی خونخواری مٹا دی ہے۔ اور اب اس کو اس قدر پالتو قسم کا بنا لیا ہے کہ وہ اس کی حفاظت میں دوسری پر غرّا سکتا ہے۔ غالباً شمیم خود کو رضا کے سپرد کر دینے میں حق بجانب ہے۔ رضا اپنی گندگی کو لے کر تین گولیوں کے سامنے سینہ سپر رہا ہے اور مارے جانے کا خطرہ ٹلتے ہی وہ ایکدم اس قدر نیک اور سیدھا بن گیا کہ غیر محفوظ شمیم کو اُس نے ہاتھ تک نہ لگایا بلکہ کمرے سے چلا جانے دیا ___ اور یہ کرن شمیم میں

تبدیلی پیدا کرنے کی باعث ہے۔

حفیظ کے ہاتھ سے تھیلا چھوٹ گیا۔ اس کی کھری اور کٹ ر طبیعت اندازہ لگانے سے قاصر رہ گئی کہ وہ کیا چیز تھی جس نے رضا کے سخت ارادے کو بند کمرے میں ڈھیلا کر دیا تھا اور وہ کیا شے تھی جس نے پستول میں دو گولیاں ہونے کے باوجود شمیم کا عزم تحفظ کمزور کر دیا تھا اور — سب سے زیادہ تعجب خیز وہ کونسا باطنی ہاتھ تھا جس نے ڈاکہ زنی کا تھیلا اس وقت اس کے ہاتھ سے چھین کر اس کی اپنی سخت طبیعت کو ریشم کی طرح ملائم کر دیا تھا اور اسے بھوری کی نا اچھوتی آغوش میں سکھ لینے کے لئے گرا دیا تھا۔

"بھوری!" اس نے اس کو مجنونانہ بھینچکر کہا۔

"حفیظ!" بھوری نے اس کے چہرے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"چلو۔ اسی وقت نکل چلو۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ وطن سے آتے ہی میں تم سے شادی کر لوں گا۔ چلو میری اچھی دلہن —" حفیظ نے کہا۔

بھوری نے حفیظ کے رات کے وقت نکلنے پر چند منٹ پہلے اعتراض کیا تھا۔ مگر اب وہی بغیر کوئی سوال کئے۔ کان دبائے اس طرح اس کے

ساتھ ہولی جیسے اسی کا سایہ تھی، اُس کی ہستی تھی، اُسی کا جسم و روح تھی!

چند منٹ پہلے حفیظ ایک بڑے مقصد کے ساتھ اچھی غایت کی پرورش کے لیے نکلنا چاہتا تھا۔ گویا حج کے لیے کسی کا گلا کاٹ کر روپیہ فراہم کر رہا تھا، اس کے احرام کے نیچے ایک جامہ نجس تھا۔ اب وہ صرف ایک طرف جھک گیا تھا کہ لوٹ مار ہی کے ذریعہ مستقل طور پر اپنے سے بندھی بھوری کا اور اپنا پیٹ پالتا رہے۔ مگر شاید اس کو اب معاش کے سلسلہ پر غورِ ثانی کے لیے مجبور ہونا پڑیگا کیونکہ بھوری اس کے ساتھ تھی ــ کسبی کی زندگی گزاری ہوئی ایک لڑکی، جس نے اپنے زمانۂ کسب میں پہلا بہتر ذریعۂ معاش ہاتھ آتے ہی اپنے نظریۂ روزگار کو بدل ڈالا تھا! یا تو ہر بُرائی میں بھی کوئی اچھائی ہے یا تمام اچھائیاں برائیوں کی پروردہ ہیں!

(۱۵)

بُرائیاں اچھائیوں کی پروردہ ہوں یا اچھائیاں بُرائیوں کی، اُنہیں اخلاق و مذہب کی عینک سے جانچنا شاید صحیح طریقۂ تحقیق نہ ہو۔ بارہا ایسا ہوا کہ نکوکاریوں کے انبار میں بھی بُرائیاں پھوٹ نکلی ہیں۔ جب کوئی شخص اپنا نصب العین قبیح بنالیتا ہے تو اس کو سوسائٹی بدکار سمجھنے لگتی ہے۔ لیکن وہی صالح و شریف طرزِ عمل اختیار کرلیتا ہے تو اس کو بھی لوگ اس کی کثیر برائیوں کا ایک جزو سمجھتے ہیں۔

حفیظ کو اس طرف نہیں آنے دیا گیا۔ جس طرف آکر وہ اپنا اور سوسائٹی کا کم نقصان کرسکتا تھا۔ کسی کو یہ احساس نہیں ہوتا ہے

ایک گناہ پسند شخص جب اپنی جگہ سے ہلتا ہے تو اس کے ساتھ ماحول کا ایک حصہ بھی ہم رکاب ہوتا ہے۔ اِس حِصّے میں اس کی ماضی تو بسی ہوئی ہوتی ہے۔ لیکن ہم مستقبل کو بھی اسی سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بُرے لوگوں کو اچھا بننے کا بہت کم موقع دیا جاتا ہے۔

حفیظ بھوری کو اپنی اور کچھ اس کی خاطر، کسی بہتر مقام تک لے جانا چاہتا تھا مگر منزل سے پہلے ہی راستہ میں ٹوک دیا گیا۔ بھوری کی ماں نے صبح اپنی کمائی کے ذریعہ کو گُم پایا تو سر پیٹ لیا۔ بر بنائے محبت نہیں بربنائے ضرورت۔ دنیا میں ہر شے بر بنائے ضرورت ہے۔ چل رہی ہے اور چلائی جا رہی ہے۔ مذہب، قانون، جنگ بدکاری اور نیکیاں غرض ہر چیز بر بنائے ضرورت اختیار کی گئی ہے۔ غور کیجیے کون سی چیز محض اِس لئے چل رہی ہے کہ اس کو چلنا ہے!

بھوری کی ماں جو متبرک تجارت کرتی چلی آ رہی تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔ اس کی دکان میں سوائے اس کے خود کے کیا رہا تھا اور اس کو اپنی کم قیمتی کا علم تھا۔ اس لئے اپنا سودا لٹ جانے کا غم

قدرتی تھا۔

اس نے اپنے ہر جہت سے غافل اور شرابی شوہر کو اکسایا۔ اس کو بتایا کہ حفیظ کتنا برا آدمی تھا کہ اس کی بیٹی کو لے بھاگا۔ اس کا پیچھا کرنا چاہیئے، گرفتار کرانا اور بھوری کو واپس گھر لانا چاہیئے کیونکہ وہ ایک بھلے گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے بھاگ جانے سے خاندان کی ناک کٹ گئی، گھر تباہ ہو گیا اور سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ کہ اب تجھے شراب بھی پینے کو نہیں ملے گی۔

بڈھے کو اس پر غور کرنے کی توفیق کب تھی کہ اس کی بیٹی کے بھاگ جانے سے اس کی شراب کیوں بند ہو جائے گی۔ ہاں اس کا بند ہو جانا نہایت غمناک تھا۔ یہ بری خبر تھی اور اسی سے وہ زیادہ متاثر ہوا۔

"مگر وہ کمبخت چلی کہاں گئی؟" بوڑھے نے اپنی خالی بوتل کو حسرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کہہ تو رہی ہوں کہ اس پاجی حفیظ کے ساتھ وہ بھاگ گئی ہے۔"

"ارے ہاں ابھی تم نے کہا تو تھا۔ اچھا تو پھر اب کیا کرنا چاہیئے؟" بوڑھے نے کہا۔

"ڈوب مرو کسی کنوئیں میں جاکر" بھوری کی ماں نے جل کر کہا۔

"اچھا ڈوب مروں؟ پھر تجھے کون کھلائے پلائے گا؟"

"تو کھلا رہا ہے مجھے؟ کھلائیگا۔" اس کی بیوی نے غصہ سے کہا۔

"اچھا — اچھا لڑو نہیں۔ یہ بتاؤ کہ بھوری کہاں ملے گی؟"

"تو جائے گا اُس مال زادی کو ڈھونڈھنے۔ تجھ سے اپنی جان تو سنبھلتی نہیں۔"

"یہ بھئی ٹھیک کہا تم نے۔" بوڑھے نے لیٹتے ہوئے کہا۔

"پھر اکہاں جارہا ہے۔ کیا تیرے گھر میں پڑے رہنے سے بھوری مل جائے گی۔ جا پولیس میں جاکر رپٹ لکھوا کر آ۔"

"رپٹ! کیسی رپٹ!"

"خدا کی مار — مُوا کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ جا سپاہی کو یہیں بلا لا۔ چوکی پاس ہی ہے۔ میں لکھوادونگی تمام باتیں۔ تو جانے کیا اُلٹی سیدھی بات لکھوا آئے گا۔"

"بھوری کی ماں تو بھی اُلٹی ہانکتی ہے۔ پولیس والا میرے کہنے سے کیوں آجائے گا تیرے پاس۔ کیا وہ تیرا یا میرا باپ

ہے۔"

چل دُور ہو۔ بک بک کیے جاتا ہے۔ دیکھ کیا ترساتی ہوں تجھے شراب سے۔ تڑپ تڑپ کر نہ مر جائے تو مجھے کہنا۔" اس کی بیوی نے جھلّا کر کہا۔ اس کے بعد اُس نے پُرانے عطر میں بسے ہوئے اپنے شکن زدہ رنگ اُڑے ہوئے ریشمی کپڑے نکالے بسن لائٹ صابن سے منہ دھویا۔ منہ پر بہت باریک پسی ہوئی کھریا ملی۔ آنکھوں میں گہرا گہرا کاجل لگایا۔ دانتوں میں مسّی ملی اور ہونٹوں پر دھڑی جمانے کو بڑا سا پان کھایا۔ پھر آئینہ میں صورت دیکھی تو اپنے کو وہ چالیس کے بجائے پچیس سال کی نظر آئی اور دوسروں کو پینتالیس برس کی۔ اس کے بعد چادر اوڑھی اور چوکی کی طرف روانہ ہوئی محلّے والوں نے فقرے کسے اس نے مسکرا کر سب کو جواب دیا۔

جب وہ چوکی پہ پہنچی تو شہوت و رشوت کے عادی سپاہیوں نے اس کا پُرجوش استقبال کیا۔ اس کا بیان قلمبند ہوا۔ اس سے کچھ وعدے لیے گئے کہ اگر اس کی لڑکی مل گئی تو پہلے وہ تھانے میں آئے گی۔

(۱۶)

حفیظ بھوری کو لے کر شہر سے فرار نہیں ہوا تھا بلکہ شہر ہی کے کسی دوسرے محلّہ میں جا کر آباد ہو گیا تھا۔ یہاں آنے کے دو تین دن بعد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ بغیر کچھ کام کئے گزارا ہونا بہت مشکل ہے مگر معاش کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی تھی۔ حفیظ کو جب تک بھوری اور اس کی ماں کی گندی تجارت کو صرف اپنے لئے رکھنا تھا اور وہ بھی اس لئے کہ بھوری متعدد ہاتھوں میں بکنے سے بچ جائے۔ اس وقت تک اس کی امداد و کفالت کی خاطر بُرے سے بُرے معاش سے نہ چونکا تھا مگر اب وہ ایک اچھے شہری کی سی زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس کی

ذمہ داری ہیں اب باقاعدگی اور آئین پیدا ہو گیا تھا سوسائٹی انسان کی بہتری کے لئے تبدیلی اور بدتر کے لئے انقلاب سے غافل رہنے کی عادی ہے۔ کئی روز تک حفیظ کوئی معاش حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ ایک روز بھوری کے اغوا کے جُرم میں سپاہی اُسے گرفتار کرتے آ پہنچے۔

حفیظ کو بے حد تعجب ہوا کہ جب تک وہ جرم کرتا رہا کسی نے اسے گرفتار نہیں کیا۔ اس نے چوریاں بھی کیں۔ جیبیں بھی کتریں۔ ڈاکے بھی ڈالے مگر پولیس کی امداد لینے والے اس وقت غافل پڑے رہے۔ اب جب کہ وہ اچھائی کے لئے چولا بدل رہا تھا تو نیکی کی پاداش میں اس کو گرفتار کیا جا رہا تھا۔ مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ یہ طریقۂ سزا اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ یہ قانونِ اخلاق اور آئینِ عدالت اس کی فہم سے بالاتر تھا۔

حفیظ اپنے چھوٹے سے افلاس زدہ مکان میں گرفتار کر لیا گیا اور اس کے ساتھ ہی بھوری بھی۔ کئی روز تک دونوں حوالات میں بند رہے۔ جُرم قبول کر لینے کے لئے اُن پر قسم قسم کی سختیاں ہوتی رہیں۔ آخر دونوں کو عدالت میں گھسیٹ لیا گیا۔

قانون کی رُو سے حفیظ کا جرم صاف تھا۔ مگر بھوری کا بیان حفیظ کو بری کر رہا تھا۔ اُس نے عدالت سے کہا کہ اس نے حفیظ سے نکاح کر لیا ہے۔ اغوا سے قبل ہی دونوں نکاح کر چکے تھے۔ حفیظ اس کو لیکر بھاگا نہ تھا بلکہ وہ خود اپنی جابر ماں سے نجات پانے کے لیے اپنے شوہر کو لے کر نکل کھڑی ہوئی تھی۔

"تمہارے نکاح کے گواہ کون لوگ ہیں؟" وکیل نے بھوری سے دریافت کیا۔

"ہم نے چپکے سے نکاح کیا تھا اس لئے کوئی گواہ فراہم نہ کر سکے تھے۔" بھوری نے جواب دیا۔

"کس نے پڑھایا تھا تمہارا نکاح؟" پھر اس سے سوال کیا گیا۔

"ایک مولوی صاحب نے۔"

"کیا نام ہے ان کا؟"

"کیا ہمارے ہاں کی دلہنیں اپنے نکاح پڑھانے والے کے نام سے آگاہ کی جاتی ہیں؟" بھوری نے منہ توڑ جواب دیا۔

"تم بتاؤ۔ کیا نام تھا تمہارے نکاح پڑھانے والے مولوی کا؟" وکیل

نے حفیظ سے پوچھا حفیظ نے نام بتا دیا۔

عدالت برخاست ہو گئی اور تاریخ پیشی بڑھا دی گئی۔ حفیظ پھر حوالات میں بند کر دیا گیا اور بھوری اپنے والدین کی نگرانی میں دے دی گئی۔ گھر پر آتے ہی اس کی سوتیلی ماں نے وہ وہ اس کو صلواتیں سنائیں کہ توبہ ہی بھلی۔ اور دوسرے روز کمائی کے لئے پھر بھوری کے پاس ایک گاہک پکڑ لائی۔ بھوری نے جو پھر اس ذلّت کو دیکھا تو اس کا رنگ فق ہو گیا۔ پیر پکڑ کر اُس نے اپنی سوتیلی ماں کی خوشامد کی کہ وہ اب دوسرے کی منکوحہ ہے۔ مگر اُس کی ماں نے گالیاں دیتے ہوئے کہا "مردار ابھی عدالت میں ثابت کہاں ہوا ہے کہ تیرا نکاح اس کمینے حفیظ سے ہوا ہے۔ بڑی آئی دوسرے کی منکوحہ بن کر۔" نکاح جب تک عدالت میں ثابت نہ ہو جائے اُس وقت تک نکاح ہی نہیں۔ بھوری نے سوچا۔

جب اس کی ماں پر اس کی آہ وزاری کا کوئی اثر نہ ہوا تو بھوری نے اپنے صیّاد ہی سے رجوع کیا۔ مگر اُس نے بھاری اور بھدّی آواز میں اس کی لجاجت کو ٹھکراتے ہوئے کہا کہ وہ رات کے بیس روپے ادا کر چکا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

دیکھئے میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔ مجھ پر اللہ رحم کیجئے۔ بھوری نے نہایت عاجزی سے کہا۔ گاہک نے مکروہ قہقہہ لگایا اور بولا۔

"تو شادی شدہ عورت ہے۔ تو؟ پھر تیری ماں کیوں آدمیوں کو لاتی ہے۔ تیرے لئے؟"

"وہ میری ماں نہیں۔ میرے باپ کی دوسری بیوی ہے۔ ہمیشہ اس نے مجھے طرح طرح کی تکلیفیں دی ہیں۔ میں نے اپنی پسند کے ایک بھلے آدمی سے بیاہ کر لیا تو وہ مجھ سے جلنے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ آج اپنی دشمنی نکالنے کے لئے وہ آپ کو پکڑ لائی۔"

"مجھے پکڑ کر وہ نہیں لائی ہے بلکہ میں پیسے دے کر آپ اپنی خوشی سے آیا ہوں۔ اچھا اب بک بک بند کر۔"

"دیکھیے۔ آپ کی اپنی بیوی، بہن وغیرہ کوئی ضرور ہو گی۔ کسی غیر مرد کے قبضہ میں ان کو دیکھ کر کیا آپ کو غصہ نہیں آئے گا۔ میں آپ سے آپ کے ہاں کی پاک صاف عورتوں کے نام پر بھیک مانگتی ہوں کہ مجھے معاف کر دیجئے۔"

"لڑکی۔ تُو تو بڑی تیز طرار نکلی۔ میرے پیسے ہی ہضم کرنا چاہتی ہے۔"
بدکار آدمی اپنی کسی کچھلی گم شدہ انسانیت کی آواز میں بولا:۔

"آپ کے روپے ---- ہاں آپ کے روپے ---- افسوس وہ ایسی جگہ پہنچ چکے ہیں کہ اب وہاں سے نہیں نکل سکتے۔ میری سوتیلی ماں مجھے مار ڈالے گی۔ آپ کی مار پیٹ برداشت کرے گی۔ مگر روپے واپس نہیں دے گی۔" بھوری نے آنکھوں میں آنسو لاکر کہا۔ وہ لڑکی جس کو اپنے اور اپنے گھر کی خاطر اس کی سوتیلی ماں استعمال کرتی رہی تھی۔ اب حفیظ سے وابستہ ہو کر وہ بھی باقاعدگی کے جامے میں آگئی تھی۔ گناہ تو بہت وزنی چیز ہے۔ اس سے مسلسل طور پر لپٹے رہنے سے انسان تھکے بغیر نہیں رہتا۔

"مگر میں اپنے پیسے تو ضائع نہیں کر سکتا۔ اگر تُو مجھ سے بچنا چاہتی ہے تو دام واپس کر دے میرے۔" مرد نے کہا۔ معقول بات تھی۔ مگر بھوری کہاں سے لاتی روپے۔ اس کے پاس تو حفیظ کے دیئے ہوئے پانچ چھ روپے پڑے ہوئے تھے۔ آخر گڑگڑا کر بولی۔

"افسوس میرے پاس بیس روپے نہیں ہیں۔ ہاں میرا میاں آجائیگا۔

تو اس سے دلوا دوں گی۔" بھوری نے کہا۔

"اس سے دلوا دے گی۔" مرد نے ہنس کر کہا۔ پھر بولا۔ "واقعی تو بہت سیدھی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ پاگل اتنا نہیں سمجھتی کہ جب تو یہ کہے گی کہ بیس روپے تجھے کسی غیر آدمی کہہ دیتے ہیں تو کیا وہ تجھ پہ شبہ نہیں کریگا۔"

بھوری سوچ میں پڑ گئی۔ پھر بولی۔

"میں ایسا کروں گی کہ جب وہ روپیہ کما کر لائیں گے تو میں چپکے سے بیس روپے ان کی جیب سے چرا لوں گی۔"

"اچھا تو چوری کرنا تو اچھا سمجھتی ہے مگر اس کام کو برا جانتی ہے؟ ہے تو دیوانی لڑکی۔" بھوری پھر خاموش ہو گئی۔ ارے ہاں۔ برا کام تو یہ دونوں ہی ہیں۔ اُس نے سوچا۔ چونکہ برائیوں کے تالاب سے ابھی نکلی تھی۔ اس لئے اُسے کسی صحیح بات کی اچھی طرح تمیز نہ تھی۔

"اچھا تو کسی اور ترکیب سے بیس روپے مانگ لوں گی اُن سے پھر تمہیں دے دوں گی۔" آخر کچھ دیر بعد اُس نے کہا۔

"وعدہ کر کب تک دے دیگی میرے روپے۔ کیا کروں تو نے بات

ایسی کہہ دی کہ میرے دل میں بیٹھ گئی۔ اب مَیں تیرے ہاتھ نہیں لگاؤں گا جا آرام کر۔ اور ہاں دیکھ پندرہ روز بعد آکر مَیں اپنے روپے لے جاؤں گا بندوبست کر رکھنا۔ مرد نے کہا اور نیچے آگیا۔ بھوری کی ماں نے اُس کو جاتے دیکھا تو مسکراتی ہوئی قریب آئی اور بولی۔

"کہاں چلے میاں۔ اتنی جلدی۔"

"تم بڑی مکّار عورت ہو۔ ہٹ جاؤ میرے سامنے سے ایک دکھیاری لڑکی کو ذبح کر رہی ہو۔" مرد نے کہا۔

"ارے وہ بڑی حرافہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے تمہیں اُس نے کوئی چکمہ دے دیا۔" بھوری کی ماں نے کہا۔

"اس سے بڑی حرافہ تم ہو۔ میرے روپے لاؤ۔ مَیں جیسا آیا تھا۔ ویسا ہی جا رہا ہوں۔" مرد نے غصّہ سے کہا۔

"روپے! کیسے روپے۔ مجھے اس سے کیا کہ تم جیسے آئے تھے ویسے ہی جا رہے ہو۔ مَیں نے کب منع کیا تھا تمہیں۔ یہ تو تمہاری اپنی مرضی ہے۔"

"اچھّا سالی! اب تیرے منہ تو کیا لگوں۔ مَیں جانتا ہوں کہ تو میرے روپے واپس نہیں کرے گی۔ پندرہ روز بعد تیری لڑکی ہی بیچاری مجھے روپے دے گی۔

اب یاروں کی جیب میں صرف پانچ روپے پڑے ہیں۔ جاتے ہیں کسی اور جگہ مزے اڑائیں گے۔ پر یاد رکھ تجھے اچھی طرح سزا دوں گا۔" مرد نے کہا۔

"ارے جا۔ بہت تجھ جیسے چوٹے چلا دیئے ہیں میں نے۔ سزا دلائیگا۔ دیکھ اس حرامزادی سے کیسا بدلہ لیتی ہوں اس کا۔ بدلے کا لفظ سُن کر بدکار مرد سست پڑ گیا۔ بھبوری سچ کہتی تھی۔ اس کی سوتیلی ماں ڈائن ہے۔ آج میں ٹل گیا تو کیا ہوا۔ کل یہ عورت کسی اور مرد کو اس بے چاری لڑکی پر لا مسلط کرے گی۔ اس کو بچانا چاہیئے۔ اس لڑکی کو پناہ دینا چاہیئے۔ بدکار مرد نے سوچا ہم بُرے افعال کرتے کرتے نامعلوم کب نیک فعل بھی کر گزرتے ہیں اور نیک کام کرتے کرتے نہ جانے کب کار بد کر جاتے ہیں۔ کیا کوئی امر یا فعل اچھا اور برا نہیں ہے؟ بلکہ اپنے نتیجے کے لحاظ سے اس کو خوب و زشت سمجھنا چاہیئے۔

(۱۷)

دوسری پیشی پر حفیظ کے مقدمے کی سماعت ہوئی تو بہت سی جرح و قدح کے بعد اور نکاح پڑھانے والے مولوی کی شہادت گزرنے پر آخر حفیظ بری کر دیا گیا۔ مولوی صاحب کے رجسٹر میں نکاح کی تاریخ کا اندراج تھا اور وہ تاریخ اغوا کے واقعہ سے ایک ہفتہ پہلے کی تھی۔

رہا ہوتے ہی حفیظ سیدھا بھوری کے پاس آیا۔ وہ محلّہ میں کہیں گئی ہوئی تھی اس کی سوتیلی ماں گھر پر موجود تھی۔ حفیظ کو دیکھتے ہی پہلے تو اس کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ مگر بڑی فریبی عورت تھی۔ اُس نے ایسی

ایکٹنگ اختیار کی کہ حفیظ بھی متاثر ہو گیا۔

"آؤ میاں۔ اللہ تمہیں گھر آنا مبارک کرے۔ ہائے تم نے مجھے پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا۔ کہ تم میری بھوری سے نکاح کر چکے ہو۔ مفت کی یہ پریشانی تو نہ اُٹھانی پڑتی۔ خیر یہ قسمت کا بدھا تھا۔ حفیظ میاں ایمان سے کہتی ہوں کہ اگر میں ساری دنیا میں چراغ لے کر ڈھونڈھتی تو تم سا داماد مجھے نہ ملتا۔"

"اچھا!" حفیظ نے ہنس کر کہا۔ اس کو تعجب ہو رہا تھا کہ یہ عورت خلافِ توقع اس قدر عمدگی سے کیوں پیش آ رہی ہے۔

"تمہارے سر کی قسم۔ رات دن تمہارا انتظار کیا کرتی تھی۔ جب سے تمہارے دشمن جیل گئے تھے اس دن سے محلہ کے مولوی سے وظیفہ پڑھوا رہی ہوں۔ اللہ کے کلام میں بھی کیسی برکت ہے۔ بس بائیس دن میں تم ہر بلا سے چھوٹ گئے۔" بھوری کی ماں نے کہا۔ قدرت نے متعجبانہ اوپر سے جھانک کر دیکھا۔

"ہاں بھوری کی ماں۔ اللہ کے کلام میں بڑی تاثیر ہے۔ بھوری کو کہاں بھیج دیا ہے تم نے؟" حفیظ نے پوچھا۔

"میں نے کیا بھیجد یا اُس کا اپنا پیر گھر میں کب ٹکتا ہے۔ تم اُدھر چلے اِدھر وہ آزاد ہو گئی۔"

"ہاں تم جیسی ماں سے اور امید ہی کیا تھی۔ لیکن میں بہ مشکل یقین کر سکتا ہوں کہ بھوری میری عدم موجودگی میں آزادی محسوس کرتی رہی ہے۔"

"اُس نے تو تم پر پھیر دی ہے اُلّو کی لکڑی۔ ذرا خود ہی سوچو۔ جو عادتیں بھوری اختیار کر چکی ہے۔ کیا وہ اس سے چھوٹ سکتی ہیں!" عورت نے حفیظ کے دل پر زہر کے چھینٹے پھینکتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس کی اُن عادتوں کی ذمہ دار بھی تم ہی ہو۔ تم ہی نے تو اس غریب کو بُرے دھندے پر لگایا تھا۔ حفیظ نے کہا۔

"اوّل تو یہ جھوٹ ہے۔ لیکن تمہاری خاطر اگر اس کو مان بھی لوں تو تم سے نکاح ہو جانے کے بعد بھی جو اس کے پُرانے لچھن جمے رہ گئے ہیں ان کی ذمہ دار تو میں نہیں ہوں۔"

"کیا مطلب — کیا کہنا چاہتی ہو تم؟" حفیظ نے ذرا پریشان ہو کر دریافت کیا۔

"مطلب تو میں کچھ جانتی نہیں۔ تم ہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا

اس نے ایک اور آدمی سے آنکھ لڑائی ہے۔ بے شرم کہیں کی۔ بے حیا نے اتنا نہ سوچا کہ خصم گیا ہوا ہے جیل میں تو کچھ اس کا خیال کرتی۔"

"بھوری کی ماں کیا بک رہی ہو — کیا کہہ رہی ہو —" حفیظ نے غصہ سے کہا۔

غصہ نہ کرو۔ اگر اُس مردار کو سیدھا کرنا چاہتے تو ٹھنڈے دل سے سنو۔"

"جلد جلد کہو۔ پہلے تو تم نے میرے دل میں آگ لگا دی اور اب کہتی ہو کہ انگارے نہ اُگلو۔ جو کچھ تمہیں کہنا ہے صاف کہو۔" حفیظ نے اُسی غصہ سے کہا۔ بھوری کی ماں چند لمحے کے لئے چپ ہو گئی۔ جیسے اُسے بھی انکشافِ حقیقت کرنے سے رنج ہے پھر بولی۔

"دیکھو میاں میں پھر کہتی ہوں کہ ٹھنڈے دل سے بات سنو۔ بات یہ ہوئی کہ کئی روز ہوئے گھر میں ایک مردوا آگھسا تھا۔ کہہ نہیں سکتی کہ وہ بھوری کا کوئی پہلے کا آشنا تھا یا کیا۔ وہ آتے ہی بھوری کو اوپر کوٹھڑی میں لے گیا۔ بہت دیر تک دونوں وہاں رہے بس اس دن سے اس کمینے نے یہ وطیرہ اختیار کر رکھا ہے کہ گلی کے نکڑ پہ آکھڑا ہوتا ہے اور ادھر

سے گزرنے والے کئی آدمیوں کو مار پیٹ چکا ہے۔ اُن پر الزام یہ لگاتا ہے کہ وہ میرے یہاں آنا چاہتے تھے اور مجھ پر اس پاجی نے یہ بہتان باندھا ہے کہ مَیں بھوری کے لئے دوسرے مردوں کو بلاتی ہوں! کئی دفعہ سوچا کہ پولیس میں رپٹ کر دوں۔ پر اس خیال سے رُک جاتی ہوں کہ تمہاری اور ہماری مفت میں بدنامی ہو جائیگی۔" بھوری کی ماں نے پورا اجال تن کر کہا۔

حفیظ کے دل میں پہلے یہ خیال کوندا کہ اس عورت کا یہ بیان شاید غلط ہے۔ اس نے پھر بھوری کو خراب کرنے کے لئے کسی آدمی کو بلایا ہو گا جسے خدا کا کوئی نیک بندہ بھوری کی حفاظت کے لئے روز بھیج دیتا ہے۔ مَیں نے خدا ترسی کی بنا پر نہ سہی کئی ماہ تک تو دوسرے جرموں کی مدد سے بھوری کو بگڑنے سے بچائے رکھا تھا۔ اس شخص میں میری جیسی قدرت نہ ہو گی۔ وہ صرف یہی کر سکتا ہو گا۔ کہ بھوری کی ماں کے بلائے ہوئے بدمعاشوں کو یہاں آنے سے روکنے کے لئے ان کو ڈرا دھمکا کر بھگا دے۔ مگر ایسے لوگ نیک کہاں ہیں، پھر یہ کیا ضروری ہے کہ اگر مَیں نے بھوری کی حفاظت کی تو ہر شخص میری ہی سنت کو دُہراتا

رہے۔ آخر اس میں ایسی خوبی کیا ہے کہ ہر شخص کو اسی کی حفاظت کا خیال ستائے۔ لاکھوں بھوریاں اور بھی پڑی ہوئی ہیں۔ جن کی آبرو کی مزید تاخت کو روکنے کا کسی کو خیال نہیں آتا۔

حفیظ کے لئے اپنے واقعات کی اونچ نیچ سمجھنا ضروری تھا۔ کیونکہ اس کی زندگی میں ایک شکستہ بھوری آگئی تھی۔ ضروری تھا کہ وہ اپنے اور اس کے واقعات کو تولے۔ ان کا خیال کرے۔ دوسری بھوریاں تمام کی تمام اوّل تو اس کے علم میں نہ تھیں اور اگر تھیں بھی تو اس کے پاس ان کے خراب کنندگان و محافظین کی کوئی فہرست نہ تھی۔

"غدّار —— بیوفا —— ذلیل عورت —— "حفیظ کے منہ سے آہستہ آہستہ نکلا۔ "غصہ تھوک ڈالو میاں۔ تم نے اپنی نیکی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مگر چور چوری کی عادت نہیں چھوڑتا ہے۔" بھوری کی ماں نے اس کو ڈھارس دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک کہتی ہو ——" حفیظ نے خیالات میں ڈوبے ہوئے کہا۔ "چور چوری کی عادت نہیں چھوڑتا —— اب چور چوری کی عادت نہیں چھوڑیگا۔"

"کیا کہہ رہے ہو حفیظ میاں۔ مَیں سمجھی نہیں۔"

"یہی کہ چور چوری کی عادت نہیں چھوڑیگا۔ بدکاری ترک نہیں کریگا۔ بدکار نے سب کچھ ترک کر کے کچھ بننا چاہا تھا۔ مگر اس کو عدالت میں گھسیٹ ڈالا گیا۔ اس نے چوریاں کر کر کے اور جرم کا ارتکاب کر کے جرم کو روکا تھا۔ بُرا کیا تھا یا بھلا کیا تھا۔ مگر وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ وہ کچھ کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ جو کچھ اب تک کر چکا تھا اس کو وہیں ختم کر کے نیکی نیکی پکارنے والوں کے کہنے میں آ کر اس نے ان کا وضع کیا ہوا ایک راستہ پکڑنا چاہا تھا۔ مگر یہ نیکی کی تعلیم دینے والے خود بھی کچھ سمجھتے ہیں — سمجھتے بھی ہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ان کی اس چیخ و پکار کے زیر و بم میں وہی چھپی ہوئی ہیں جو میرے زیرِ عمل رہی ہیں اور جن کی وجہ سے میں بدکار مشہور کر دیا گیا ہوں۔ بھوری نے میری پناہ لی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے عورت پن کی حفاظت چاہتی تھی۔ نامعلوم کیا واقعات پیدا ہو گئے تھے کہ ہم دونوں چلتے چلتے تھم گئے تھے اور ہمارے تھمتے ہی عدالت، جیل اور غدّاری آ کودی۔ زندگی کو رواں رہنا چاہیئے۔ اس تیزی سے رواں رہنا چاہیئے کہ اس سے شرارے جھڑنے لگیں۔ پھر شعلے اور لپٹیں اُٹھنے لگیں — آگ ہی آگ ہو — ہر طرف آگ ہی آگ ہو — سبھی بھوری

کی ماں ہر سمت آگ ہی آگ ہو — آگ — آگ — ہاہا آگ —"

حفیظ دیوانگی میں قہقہے لگا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا اور مُنہ میں کف، دُور دُور تک اس کی تھوک کی چھینٹیں اچٹ کر پڑ رہی تھیں — اس کے بعد وہ دیوانہ وار باہر نکل گیا۔

بھوری کی ماں کو ایسا معلوم ہوُا جیسے واقعی تمام جہان میں آگ لگ گئی ہے! لیکن وہ خود اکیلی ہی اس آگ کی لپیٹ سے محفوظ رہی ہے۔

(۱۸)

بعض اوقات ذراسی بات زندگی کا رُخ بدل دیتی ہے۔ اگر حفیظ اس وقت عجلت سے کام نہ لیتا تو بہت ممکن تھا کہ وہ اپنی چھوڑی ہوئی زندگی کی طرف پھر رُخ کرنے کا خیال نہ کرتا، ایک طرفہ بیان سُن کر وہ اِس قدر متاثر ہو گیا تھا کہ اصل واقعات کی تحقیق کرنے کی بھی اس نے کوشش نہ کی یہ اس کی حماقت تھی۔ اس عورت کے بیان کو اس نے سچ مان لیا جس نے اس کو جیل پہنچایا تھا اور اس پر مقدمہ دائر کیا تھا۔

یہاں سے نکل کر حفیظ بہت دیر تک بھٹکتا رہا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ پیسے پاس نہیں تھے۔ اپنے ایک شناسا کے ہوٹل میں جا کر ادھار کھانا کھایا

اور جلد دام ادا کرنے کا وعدہ کر کے وہاں سے نکل گیا۔

وہ دُور باغ میں جا کر ایک بنچ پر پڑ گیا۔ بھوری کی بے وفائی اور بدچلنی کا اُس کو بہت رنج تھا۔ کبھی اسے اس قدر شدید غصہ آتا کہ وہ کئی بار اسی وقت بھوری کو جا کر مار ڈالنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ مگر ٹہل ٹہل کر بیٹھ گیا۔ سوچتے سوچتے اس کا دماغ مختل ہو گیا۔ بارہا یہ خیال بھی اس کے دل میں آیا کہ ممکن ہے۔ بھوری کی ماں نے غلط بیانی سے کام لیا ہو۔ مگر اس کی ضرورت کیا تھی۔ لاکھ وہ بھوری کی سوتیلی ماں تھی۔ مگر اس نے اپنی لڑکی کے نام اور اپنے گھرانے کی عزّت کی خاطر حفیظ پر اغوا کا مقدمہ چلایا۔ اب وہی عورت کس طرح اپنی زیرِ نگرانی لڑکی کے خلاف جا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ ابھی اس کے بیان کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ بھوری کا آشنا روز اُٹھ نو بجے رات کو گلی کی طرف آتا ہے اور ہر آنے جانے والے کو ٹوکتا ہے۔ مَیں جا کر دیکھتا ہوں اگر وہ شخص وہاں نظر آیا تو سمجھ لینا چاہیئے کہ بھوری کی ماں کا بیان غلط نہیں ہے۔

رات ہو چکی تھی حفیظ اُٹھا اور شرابی کی طرح لڑکھڑاتا ہوا بھوری

کے مکان کی طرف روانہ ہوا۔ اس وقت اس کے دل میں خود بخود یہ آرزو پیدا ہو رہی تھی کہ خدا کرے بھوری کی ماں کا بیان غلط ثابت ہو۔ کیا اچھا ہو کہ وہ شخص گلی میں نہ ملے۔ خدا کرے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ وہ گھر میں گھس کر بھوری کو آغوش میں لے لیگا۔

وہ سر جھکائے خیالات میں غلطاں و پیچاں چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ نامعلوم کب بھوری کا مکان آگیا۔ وہ کچھ اس قدر گم تھا کہ اس کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ یہاں گلی میں بھوری کے آشنا سے ٹکر لینی ہے؛ یا کم سے کم اُسے دیکھ کر اپنے دل کو اطمینان تو دلانا ہے۔

گلی طے کر کے وہ بھوری کے مکان میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آکر زور سے اس کا شانہ تھاما اور باہر گھسیٹ لیا۔ تو حفیظ کے حواس بیدار ہوئے اور اسے خیال آیا کہ شاید بھوری کا آشنا یہی ہے۔ پہلے تو اُس نے غیظ میں اس کے منہ پر تھپڑ رسید کرنا چاہا۔ لیکن سنبھل گیا اور درشت لہجہ میں بولا۔

"تم کون ہو؟"

"اور تم کون ہو؟" بدکار مرد نے پوچھا۔

"مَیں کوئی بھی سہی!" حفیظ نے کہا۔

"اس گھر میں کیا کرنے جا رہے ہو تم؟" بدکار مرد نے پوچھا۔

"میں ـــــ بتاؤں تجھے؟ یہاں ایک جوان لڑکی رہتی ہے۔ بالکل پٹاخہ آشنا ہے وہ میری۔ اُسی سے ملنے جا رہا ہوں۔ چلتے ہو تم بھی۔ پیسے ہیں گرہ میں کچھ"؟ حفیظ نے اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔

"تم اس مکان میں ایک قدم نہیں رکھ سکتے۔ اب یہاں تم جیسے بدمعاشوں کا گزر نہیں ہو سکتا۔" بدکار نے کہا۔

"اچھّا بیٹا وہ تم ہی ہو بھوری کے نئے آشنا۔ خیر ـــــ معلوم ہو گیا۔ مَیں یہی معلوم کرنے آیا تھا ـــــ ذلیل ـــــ ذلیل۔" حفیظ پر ایک دم اوس سی پڑ گئی۔ اس کا تمام غصّہ فرو ہو گیا۔ اور جس طرح گمشدگی کے عالم میں وہ آیا تھا۔ اسی طرح پیر لٹکائے واپس چلا گیا۔

بدکار مرد کو حفیظ کی اس کیفیّت پر سخت حیرت ہوئی۔ کون تھا وہ۔ اُس نے دل میں سوچا اور لپک کر گلی کے نکڑ پر حفیظ کو جا لیا۔

"سننا ذرا ـــــ اے ـــــ کیا نام ہے تمہارا۔" اُس نے کہا۔ حفیظ نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔

"سالہ مرعوب کرنا چاہتا ہے یاروں کو۔" بدکار نے کہا اور اپنی جگہ پر آ گیا۔

حفیظ راستہ بھر سوچتا رہا کہ یہ شخص آخر اس طرح اور لوگوں کو بھوری کے پاس جانے سے کیوں روکتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس بھی اُسے کھلانے کو پیسے نہیں رہے ہیں۔ اس لئے چاہتا ہے کہ اگر وہ بھوری کو برت سکے تو اور کوئی بھی اس کے ہاتھ نہ لگائے خیال اچھا ہے اس کا۔ خدا جانے کس طرح اس نے بھوری پر اپنا اثر جما لیا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے بالکل مایوس ہو چکی ہو گی۔ بڑی بیوقوفی کی اس نے کچھ دن تو اسے میرا انتظار کرنا چاہیئے تھا۔

یہاں انتظار کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ وہ ایک ذلیل عورت کی غلط بیانی کا شکار ہو کر بھوری سے دست کش ہوا تھا۔ اس سے دست کش ہوتے ہی اپنی حال کی اختیار کی ہوئی ایک ہموار زندگی سے بھی اکھڑ رہا تھا۔ ایک بے اصولا انسان کچھ ماہ ہوئے گناہ کرنے بھوری کے پاس آیا۔ اس نے گناہ کیا تو اس پختگی سے کیا کہ آئندہ اس کی غیرتِ گناہ نے گوارا نہ کیا کہ اس کے سوا کوئی دوسرا شخص بھی

آئندہ اس کا شریکِ گناہ ہو سکے۔ اِس طرح دوسروں کی مزید تاخت سے بھوری بچ گئی۔ یہ غار کے انسان نے غار کی عورت پر ایک چھوٹا سا احسان کیا تھا۔ اور اس کے جواب میں ایک بگڑی ہوئی عورت نے اس کے احسان کا بدلہ اس طرح چکایا کہ اپنے ساتھ رکھ کر اس نے اس انسان کو ایک ہلکا سا کیریکٹر بخش دیا۔ زندگیاں چونکہ دونوں کی آپس میں بندھ چکی تھیں۔ اس لئے اپنے ہی عرااکئے ہوئے اس کیریکٹر سے بھوری بھی متاثر ہو کر سدھر گئی لیکن زیادہ عادی گناہ اور کم خوگرِ ثواب انسان اس نئی سطح پر زیادہ نہ ٹک سکا۔ چونکہ اس کا طرزِ تفکّر ابھی کم و بیش وہی تھا۔ جو عرصۂ جاہلیت میں تھا۔ اِس لئے وہ اپنی غلط کاری کی بنا پر غلط کار بھوری کی ماں کے دھکّے سے پھسل گیا اور زمین پر گر پڑا۔

اب اس کا نہ کوئی گھر تھا۔ نہ کوئی ٹھکانا۔ سرائے میں جگہ نہیں ملی۔ پیسے نہ ہونے کی وجہ سے وہ کوئی چھت دار جائے پناہ نہیں پا سکتا تھا۔ مسجد ـــــ مسجد کا اُسے خیال آیا۔ عبادت کے لئے مسجد بنوانے کی تہ میں کہیں اس مقدّس عمارت کی تعمیر کی غائت یہ تو نہیں

ہے کہ اس میں آسودگی پناہ کے لئے حفیظ جیسی روحیں بھی کبھی آجائیں
مسجد تو صرف جائے عبادت بتائی جاتی ہے۔ اور اس میں قیام کے
مستحق فقط پاک لوگ بتائے جاتے ہیں۔ مگر ناپاک لوگ کہاں جائیں۔

آخر رات کے گیارہ بجے کے قریب حفیظ ڈرتے ڈرتے ایک مسجد میں داخل ہوا۔ وہ اس عمارت میں داخل ہونے سے اس طرح جھجک رہا تھا۔ جیسے یہ کسی غیر متواضع انسان کا مکان ہے اور وہ ایک ناخواندہ مہمان۔ اس نے احتراماً پیر دھو لئے۔ اپنے ناپاک پیر، اس کے ناپاک جسم کو ناپاک مقاموں پر لے جانے والے نجس پیر۔ اس کے بعد وہ کسی نادیدہ انسان کی ڈانٹ سننے کے خوف سے آگے بڑھا۔ محراب میں آیا اور ممبر کا تکیہ لگا کر بیٹھ گیا۔

چوری کے ڈر سے بعد نماز مسجد سے دریاں اٹھا لی گئی تھیں۔

اچھا تو یہاں ادائے پنجگانہ کے لئے ایسے لوگ بھی آتے ہیں —— یعنی حفیظ بھی آتے ہیں۔ وہ اور کیا کیا نہ کرتے ہونگے۔ چوریاں کرتے ہونگے محلّے کی جوان عورتوں کو تاکتے ہوں گے اور بربنائے جامۂ طہارت کچھ حصہ تک "پاک محبت" چلتی ہوگی۔ اس کے بعد جونہی دسترس میسّر آگئی بر

چیز راستے سے ہٹ جاتی ہوگی اور ننگا ننگے کو دیکھ لیتا ہوگا۔
یہاں تجارت پیشہ بھی آتے ہوں گے۔ وہ اس طرح مال چھپائے
ہوتے ہوں گے۔ ایسے چوری چھپے اُس کو جھوٹ میں لپیٹ کر
ملبس گنا قیمت پر بیچتے ہوں گے کہ ان کی دانست میں خدا بھی
نہ دیکھ سکتا ہوگا، ورنہ وہ اتنے ڈھیٹ نہیں ہیں کہ باہر جرم کر کے
یہاں روز خدا کے سامنے بیباکی سے آکھڑے ہوں۔ یہ چٹائیوں پر
اور مسجد کے چمکدار فرش میں چھوٹے اور گول گول کالے داغ سے
کیا ہیں ——— سجدوں نے میل کے داغ ڈال دیئے ہیں۔
سمجھ میں نہیں آتا وہ کیسی کالی پیشانیاں ہیں، کیسے میل بھرے
سجدے ہیں، یہ کیسا غلط مبحث ہے۔ کہنیوں تک ہاتھ، ٹخنوں تک
پیر دھو کر اور حلق کے آخری حصّے تک غرّارہ کر کے یہ لوگ مسجد
میں آتے ہیں۔ اور پھر بھی اپنی کثافتیں یہاں چھوڑ جاتے ہیں۔
حفیظ نے ان تمام امور پر غور کیا۔ وہ یہاں عبادت کے لئے
نہیں آیا تھا۔ بلکہ صاف دلی سے جس غرض کے لئے آیا تھا۔ اس
کی تکمیل کر رہا تھا۔ وہ یہاں سونا چاہتا تھا۔ باہر سے گناہ کما کر

ثواب جوئی کے حیلے سے وہ یہاں نہیں آیا تھا۔ اس کی نیت میں مسجد کی کوئی چیز چرانی نہ تھی۔ وہ جیسا باہر سے آیا تھا۔ ویسا ہی تمام رات یہاں رہا۔ اس نے مسجدوں کا تماشا دیکھنے والے کو کوئی دھوکا نہ دیا۔ وہ اُن سب سے اچھا تھا جو اپنی کالی جبینوں سے یہاں کالے میل کی کالی کالی مہریں لگا گئے تھے۔

اس کے سرہانے قرآن رکھا تھا۔ اس کا سر منبر پہ تھا منبر جس پر کرۂ ارض و کائنات کے سب سے بڑے اور سب سے پاک انسان کے قدم رہا کرتے تھے۔ اس کے زیرِ سر تھا۔ مگر جلد اس کے سر میں درد ہونے لگا منبر کے پتھر سے پیروں کے پسینے کی سخت بو اُٹھ رہی تھی تعفن۔ قدم بدل گئے تھے۔ یہاں اب وہ پیر نہیں رکھے جا رہے تھے جو راہ حق کی طرف جایا کرتے تھے اور جن کو خندی قومیں اتنا زخمی کر دیا کرتی تھیں کہ وہ خون سے جوتے میں چپک جایا کرتے تھے۔ لیکن اس منبر پر سے اُن پیروں کی تعفن اُٹھ رہی تھی۔ جو روٹیاں سمیٹتے، گندے، سڑے اور ناپاک تنگ محلوں میں جایا کرتے ہیں۔

حفیظ سو گیا —— سوتے میں اس کے چہرے پر بہت دیر تک

دہشت، خوف اور کراہت کے آثار نمایاں رہے — پھر وہ مسکرا رہا تھا — ایک افسردہ سی مسکراہٹ جیسے خواب میں پیار کرنے والے نے یہ تبسّم اسے بڑی دیر میں عطا کیا ہو!

(۱۹)

صبح مسجد سے نکل کر حفیظ پھر گندی دنیا میں آگیا۔ رات کو اسے گندے سجدوں کے نشانات نے پریشان کیا تھا۔ مگر جو میٹھی نیند مسجد کے سخت فرش نے اُسے بخشی تھی۔ اس کا شکریہ ادا کرنا باقی تھا۔ کوئی اسے وہاں نظر نہ آیا جس کا شکریہ ادا کرتا اور جو ہمیشہ چھپا رہ کر اپنی عنایتوں کی شکر گذاری مانگتا ہے وہ حفیظ کے خیال میں آتا ہی نہ تھا۔

دوپہر تک وہ اِدھر اُدھر بھوکا پھرتا رہا۔ ہلکی سی غیرت سمجھئے یا ہچکچاہٹ کہ اب وہ بارِ دیگر اپنے شناسا ہوٹل والے کے پاس جا کر پھر اُدھار کھانا

کھانے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ کافی دیر تک جب کوئی آسرا نظر نہ آیا تو پان شاپ والا سیٹھ یاد آیا۔ بہت دنوں سے اس کے پاس نہیں گیا تھا۔ جاتا بھی کس بنا پر۔ رہن رکھنے کو پاس کیا رہا تھا۔ بہر نوع وہ پرانی تلخیوں کا آسرا لے کر دکان میں پہنچا۔

آج بھی دکان میں کئی ضرورتمند اپنی قیمتی چیزیں رہن رکھنے کیلئے موجود تھے اور ضرورت کے ہاتھوں مجبور ہو کر تھوڑے پیسوں میں ہی خوش خوش چلے جا رہے تھے۔ حفیظ کو چونکہ آج کچھ رہن نہیں رکھنا تھا۔ اس لئے وہ غیر متعلق انسان کی طرح اندر آیا اور وقت گزارنے کو ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سیٹھ نے اُس کو دیکھا اور پھر اپنے گاہکوں میں مصروف ہو گیا۔

جب سیٹھ اس کی طرف مخاطب نہ ہوا تو حفیظ خود ہی آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا اور قریب جا کر چپکے سے بولا۔

"سیٹھ صاحب ذرا ہماری بھی سُن لو۔"

"کیا ہے۔" اُس نے ڈانٹ کر کہا۔ "پھر آمرا تو۔"

"مجھے پانچ روپے اُدھار دے دو۔ کل نہیں تو پرسوں ضرور دے جاؤنگا۔" حفیظ نے نیک نیّتی کے ساتھ کہا۔

"جا بے۔ یہ کسی مہاجن کی دوکان نہیں ہے کہ میں ادھار کھاتا کھولوں کچھ پاس ہو تو رہن رکھ جا۔ ورنہ اپنا رستہ لے۔" سیٹھ نے کہا اور دوسری طرف چلا گیا۔

"اچھّا سالے۔" حفیظ نے اپنے بھوکے پیٹ کو پکڑتے ہوئے کہا۔ اور غصّہ سے باہر نکل آیا۔

اب کہاں جائے۔ کیا کرے۔ اس کے پیر خود بخود اپنے شناسا کے ریسٹورنٹ کی طرف مڑ گئے اور وہ کھانے کی میز کے سامنے اس طرح جا بیٹھا جیسے آج بڑے سے بڑا بل بآسانی ادا کر سکتا ہے۔

جب پیٹ بھر گیا تو پیسوں کا خیال آیا۔ اُٹھا ہاتھ دھوئے۔ مسکرا کر اپنے شناسا ہوٹل والے کو سلام کیا اور باہر نکل گیا۔ پیچھے سے آئے بابا نے پکارا "ایک روپیہ چار آنے۔ ایک روپیہ چار آنے۔ اس بھائی سے ایک روپیہ چار آنے۔" ہوٹل والا حفیظ کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

حفیظ کو سیٹھ پر سخت غصہ آرہا تھا۔ موت آئی ہے اس کی میرے ہاتھ سے۔ اس نے زیر لب کہا۔ اور بازار کی طرف نکل گیا۔ کتنا پاجی ہے یہ سیٹھ۔ خبیث کو ذرا کسی سے ہمدردی نہیں۔ لوٹے جارہا ہے زمانے

کو۔ اور مجھے تو اس حرامزادے نے بالکل ہی کھوکھلا کر دیا۔ قیمتی قیمتی چیزیں کوڑیوں کے مول ہضم کر گیا۔ اسے تو ایسی جگہ لے جا کر مارا جائے جہاں پانی نہ ملے ـــــ مار دیا جائے اسے ؟ یہ سوال پہلی دفعہ سنجیدگی سے اُس کے ذہن میں آیا اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ہاتھوں میں ایسی کپکپی سی پیدا ہونے لگی جیسے واقعی اس کو قتل کرنے ابھی جا رہا ہے۔

اُس نے بیشک متعدد جرم کیے تھے مگر انسان کو آج تک قتل نہیں کیا تھا۔ اس کا تجربہ کرنا مقصود نہ تھا۔ بلکہ ضرور زیادہ سیٹھ کو قتل کرنے کی تمنا اپنے دل میں پال رہا تھا۔

تو مار ڈالوں اس لعین کو۔ حفیظ نے پھر ہلکی سی کپکپی کے ساتھ سوچا۔ ہاں اب خوف کس چیز کا ہے، مانع کیا امر ہے۔ بھوری زندگی سے نکل گئی۔ اُس نے ایسی آنچ دی تھی جس سے وہ شاید خود نہ تپ سکی تھی۔ ایسی آنچوں سے کیا فائدہ۔ بڑی غلط بھٹیاں بنائی گئی ہیں۔ وہ ایک دم ایسی آنچ پہنچانے لگتی ہیں کہ مادہ شعلہ کی طرح پہلی ہی حرارت سے گھبرا کر نکل بھاگنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔

بھوری کے پیر کی موچ نکل گئی تھی۔ نکال دی گئی تھی۔ نہیں خود اُسی نے نکال دی تھی۔ پھر کیوں وہ لنگڑا رہی تھی۔ یہ حفیظ کا غلط اندازہ تھا۔ بھوری میں اب لنگ باقی نہ رہا تھا۔ چونکہ اُس کے ٹھیک ہو جانے کے بعد خود اپنے ہاتھ پیر توڑ بیٹھا تھا۔ اس لئے اس کو نہ صرف بھوری بلکہ دنیا ہی لنگڑی نظر آرہی تھی۔ اس کے علاوہ اُس پر قبل از وقت خون سوار ہو گیا تھا۔ اِس لئے اس وقت وہ ہر شخص کو بلا استثناء ظالم و مظلوم قاتل کی آنکھ سے دیکھنے لگا۔

قتل کر کے رہوں گا میں اس خبیث سیٹھ کو۔ حفیظ نے پھر اپنے خیالات کے پچھلے سرے کو پکڑا۔ مگر سنگین جُرم کے باب میں ابھی اس کا بگڑا ہوا کردار زیادہ بیباک نہیں ہوا تھا۔ جب بھی وہ طیش میں آکر سیٹھ کے قتل کی تجویز پر غور کرتا اسی وقت اس کے دل میں خود بخود ایسے حیلے پیدا ہونے لگتے جن سے اس کا یہ ارادۂ فاسد کمزور پڑ جاتا۔ وہ پھر ان حیلوں کو توڑتا اور از سرِ نو عزم باندھتا۔ بہت دیر کی کشمکش کے بعد آخر حیلے ختم ہو گئے اور تنہا عزم رہ گیا۔ جس میں اعصابی کمزوری اب بھی شامل تھی۔

آخر رات ہوگئی۔ اور شب کی راحت بخش گھڑیاں اس کو ترغیب دینے لگیں۔ کہ یہ آرام کا وقت ہے۔ بس اب کھا پی کر سو جا۔ مگر بھوک، دن بھر کی جسمانی و ذہنی کوفت، پھر ارادوں کی سفّاکی کے مارے ہوئے جسم کو ابھی کام کرنا تھا۔ راحت کیسی۔ اس لئے وہ ایک ایسی دکان پہ پہنچا جو بند ہونے کے قریب تھی اور اس طرح چیزوں کو اُلٹ پلٹ کرنے لگا۔ گویا جلدی سے کوئی چیز خریدنا چاہتا ہے۔ دکاندار دکان بند کرتا رہا۔ حفیظ نے لپک کر ایک چاقو چرا لیا اور کوئی دوسری چیز اُٹھا کر اس کی قیمت دریافت کی۔ سودا نہ ہؤا۔ حفیظ چل دیا۔

جب تک ارادہ مصمم نہ تھا اُس میں تذبذب پیدا ہوتا رہا۔ اب جب کہ اُس نے پختگی اختیار کر لی تو حفیظ پر عزم بالجزم کا نشہ سا چڑھ گیا۔ اب ہر چیز اس کے حافظہ سے نکل گئی اور صرف قتل کا ارادہ اُس کے جسم پر چھایا رہ گیا۔ اُس کے پیر سیٹھ کے مکان کی طرف اُٹھ گئے۔ منزلِ مقصود تک پہنچنے پر اسے ایک آخری جھرجھری سی آئی اور فوراً اتر گئی۔

اب حفیظ اطمینان سے زینے پہ چڑھ رہا تھا۔ ساڑھے نو بج چکے

تھے۔ گلی میں آمد و رفت زیادہ نہیں رہی تھی۔ سیٹھ اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا کھاتا کھولے رہن رکھی ہوئی چیزوں کو اس میں ڈبو رہا تھا۔ رات کو بھی اکثر اس کے پاس گاہک آجاتے تھے اور گھر پر وہ دکان کے مقابلہ میں اور بھی زیادہ کم داموں میں چیزیں لیا کرتا تھا۔

حفیظ جب سیٹھ کے کمرے میں پہنچا تو شدّت جذبات میں ایک دو سکینڈ اس کو سیٹھ نظر نہ آیا۔ اس کو کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کی یہ کیفیت تھی جیسے آنکھیں چندھیا گئی ہوں۔ آخر عزائم نے اس کے جسم میں کروٹ لی۔ اس کا ہاتھ اس طرح اُٹھا جیسے ایک کل ہو۔ دوسرے لمحہ چاقو سیٹھ کے دل میں گھس گیا اور وہ موت کی انتہائی کرب کی چیخ کے بعد وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ حفیظ اسی طرح چاقو سیٹھ کے سینے میں لگا ہوا چھوڑ کر کچھ اطمینان کچھ ہیبت کے ساتھ زینے سے اُترنے لگا۔ درمیان کی سیڑھیوں پر اُس نے ایک آدمی کو اُوپر چڑھتے دیکھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی کیونکہ یہاں مالی پریشانیوں سے دبے ہوئے روز ہی سینکڑوں گاہک آیا کرتے تھے۔ کون کس کو دیکھتا۔ لیکن حفیظ چونکہ مُجرم تھا وہ اوپر جانے والے کو دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ پورے دماغ پر اس وقت

صرف فرار ہو جانے کی اشد ضرورت مسلط تھی۔ اِس لئے فی الفور وہ آنے والے کو پہچان نہ سکا اور آنے والے نے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں۔

اوپر جانے والا وہی بدکار مرد تھا۔ اس کے فرشتوں کو بھی گمان نہ تھا کہ سیٹھ ابھی ابھی قتل ہوا ہے۔ اور اس کا قاتل چند سیکنڈ پیشتر ہی اس کے پاس سے زینہ پر سے گزرا ہے۔ جب وہ کمرے میں پہنچا تو وہاں کے منظر کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ سیٹھ اپنی چوکی پر خون میں تربتر چت پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور چہرے پر کربِ مرگ کے بھیانک آثار تھے۔

بدکار مرد ایک لمحہ کے لئے سنّاٹے میں آگیا۔ اس کے بعد ارادے کے خلا میں ایک ہلکی سی چمک پیدا ہوئی اور اس نے اُلٹے پیر بھاگ جانا چاہا کہ سیٹھ کی چیخ سن کر دوسری طرف سے دوڑ کر کمرے میں داخل ہوئے لمحہ کے عشاریہ میں اُنہوں نے منظر کو دیکھا اور کمرے میں سے ایک آدمی کو بھاگتا ہوا پایا جسے بجلی کی طرح بڑھ کر انہوں نے پکڑ لیا۔

یہ تمام کام چند لمحات میں ہو گیا۔ ہو سکتا ہے کہ بدکار مرد نے بھی زینہ پر سیٹھ کی چیخ سنی ہو اور صرف حیرت اس کو کمرے میں لے گئی ہو ساتھ

ہی یہ چیخ دونوں نوکروں کو بھی پکڑ لائی یوں بدکار مرد کا نوکروں سے آمنا سامنا ہو گیا اور وہ قاتل کے مصدقہ و مکمل حالات میں اُسی وقت گرفتار کر لیا گیا۔

"میں نے یہ ___ کام نہیں کیا ہے ___ میں نے نہیں مارا ہے سیٹھ کو" بدکار مرد نے پہلے کشمکش کے ساتھ اور بعد کو ہلکے سے اطمینان سے کہا۔

"ارے پاپی یہ تو نے کیا کیا ___ ہمارے مالک کو مار ڈالا ___ خون ___ خون ___" نوکروں نے شور مچاتے ہوئے کہا۔

"میں نے نہیں مارا ہے سیٹھ جی کو۔ میں نے نہیں مارا میں بالکل بے قصور ہوں۔ بدکار نے گھبرا کر چیختے ہوئے کہا۔

اتنے میں گھر کے اور آدمی جمع ہو گئے۔ فوراً پولیس کو ٹیلیفون کیا گیا اور ناکردہ گناہ بدکار کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس غریب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہوا۔ وہ تو یہاں روپیہ اُدھار لینے آیا تھا، اس کے ہاتھ میں کیا جیب تک میں چاقو نہ تھا۔ اس کے ارادہ میں کوئی کھوٹ نہ تھی۔ اس نے ہرگز سیٹھ کو قتل نہیں کیا۔ پھر کون مار گیا اس کو۔ اس کے ذہن میں زینے سے نیچے اتر کر جانے والے شخص کا خیال آیا۔ وہ کون تھا۔ کون تھا وہ؟ اس کی شکل کیسی تھی۔ کہیں وہی تو سیٹھ کا قاتل نہیں ہے۔ یقیناً وہی ہے

وہ جرم کر کے فرار ہو گیا اور مجھے پھنسا گیا۔ بدکار مرد نے سخت اور تنگ ہتھکڑیوں کو اپنے ہاتھوں میں دیکھتے ہوئے سوچا۔

رہن کی دکان میں اب بھی ہزاروں لاکھوں کا مال تھا۔ دکان کے گرد اب بھی بہت سے ضرورتمند چکّر لگا رہے تھے، روپیہ اب بھی چیزوں پر دیا جا رہا تھا۔ لیکن ان تمام چیزوں کے درمیان وہ شخص نہ رہا تھا جس نے حفیظ کو اپنے قتل پر اُبھارا تھا۔ کتنا ناکام و نامراد انسان تھا یہ سیٹھ کہ جان سے بھی گیا اور اپنے قاتل کا بھی کچھ نہ بگاڑ سکا۔

حفیظ یہاں سے فارغ ہو کر سینما کی طرف جا نکلا اور بھیڑ میں گُم ہو گیا جب چند منٹ کے بعد وہ باہر نکلا تو اس کے پاس کئی نوٹ تھے۔ ایک شخص کو قتل کر کے وہ روپیہ حاصل نہ کر سکا بلکہ صرف اپنے دل کو ٹھنڈا کر سکا تھا مگر سینما کے پاس وہ بغیر کسی کو قتل کیئے کافی روپیہ فراہم کر چکا تھا۔ معلوم نہیں کونسا فعل اچھّا تھا اور کونسا بُرا۔ دونوں بُرے تھے یا دونوں اچھّے!

(۲۰)

آج حفیظ کی ہمت مسجد میں رات گزارنے کی نہیں ہو رہی تھی۔ کیونکہ اس نے آج قتل بھی کیا تھا اور چوری بھی۔ اس نے اب تک کسی مسجد میں جا کر ماتھا نہیں ٹیکا تھا۔ مگر اس کا خیال تھا کہ اگر باوضو ہو کر بھی آج سجدہ کرے تو اس کی پیشانی سے بھی کالا اور میل بھرا سجدہ ٹپکے گا۔ چنانچہ اس نے نہ تو خدا سے مذاق کرنا پسند کیا۔ اور نہ اپنی انسانیت خام کی ذلت گوارا کی۔ ایک ہوٹل کا راستہ لیا۔ وہیں قیام کیا۔ ڈٹ کر کھانا کھایا اور آرام سے انیڈنا چاہا۔

مگر وہ شب کو سو نہ سکا۔ اس کے سامنے ہر بار مقتول سیٹھ کا بھیانک

چہرہ آموجود ہوتا تھا۔ اس کے دل میں چاقو پیوست ہوتے ہی اس کا کربناک چیخ مار کر سرد ہو جانا اور سرد ہوتے ہی اس کی صورت کا مسخ ہو جانا پھر وہاں سے حفیظ کا دھڑکتے دل سے سہمے سہمے مگر عجلت میں زینے سے اترنا ——— اور ——— اور ——— زینے میں ایک آدمی سے مڈبھیڑ ہو جانا ——— کون تھا وہ؟ ——— وہ کون تھا؟ دفعتاً یہ سوال حفیظ کے دل کو جھنجھوڑنے لگا۔ اسے میں نے کہیں دیکھا ہے۔ دیکھا ضرور ہے کہیں۔

اسی طرح حفیظ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ کبھی اس کا بوجھل دماغ نیند میں ڈوبنے لگتا اور کبھی وہ باہر ذرا سے کھٹکے پر چونک پڑتا۔ پھر گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا اور دبے پیر دروازے پر کان لگا کر باہر کی آواز سننے لگتا۔ وہم۔ وہ سوچتا اور واپس پلنگ پر آ بیٹھتا۔ مگر دفعتہً اس طرح اُچھل پڑتا جیسے کسی نے اس کے ڈنک مار دیا۔ سراسیمہ ہو کر وہ بستر کو جھاڑتا۔ کھڑکی کا ذرا سا پٹ کھول کر باہر جھانکتا۔ باہر افق کا تمام چہرہ سیاہ نظر آتا اور رات سناٹے میں اس طرح چھائی ہوئی معلوم ہوتی جیسے خود بھی سو گئی ہو۔ دور بجلی کے کھمبے کے آس پاس چاٹ کھانے والوں کے پھینکے ہوئے دونے اور مسلے مسلائے کاغذ ہوا سے اس طرح لڑکھڑاتے

ہوئے اِدھر اُدھر چکر لگا رہے تھے جیسے کوئی نظر نہ آنے والا انسان حفیظ کی کھڑکی کا طواف کر رہا ہو اور اس کی ٹانگوں پر صرف پنڈلیوں تک سفید پاجامہ متحرک دکھائی دے رہا ہو۔ خالی دونوں کو کتا چاٹ رہا تھا۔ اور اس سے اس قدر کھڑکھڑاہٹ ہو رہی تھی کہ حفیظ کو ہر بار یہ گمان گزرا گویا پولیس کی لاری عین ہوٹل کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی ہے نہیں بلکہ زینے پر بھی وہ لاری تیزی سے چڑھتی چلی آئی ہے اور حفیظ کے کمرے کے دروازے پر زور سے آ کر ٹکرائی ہے۔

اس کے تمام جسم میں سے پسینہ نکل آیا۔ کل کی مسجد والی رات ان گندے سجدوں کے درمیان اتنی مہیب نہیں گزری تھی جتنی آج کی شب ایک شاندار ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں گزر رہی تھی۔ کل شاید مسجد میں فرشتے سجدے سمیٹنے آ گئے تھے اور ایک غیر ملوث مگر غیر ساجد روح پر ترس کھا کر اس کو تھپک تھپک کر سلا گئے تھے آج اس کے جسم سے ایک خبیث روح چمٹی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ شاید اس کی اپنی روح ہی خبیث بن گئی تھی۔ ہاتھ پیر اور دماغ وہی تھا جو پہلے تھا۔ مگر فکر وہ نہ رہی تھی۔ آج غلط فکری نے اس کو غلط کار بنا دیا تھا۔ اس میں کس کا ہاتھ تھا؟ حفیظ

کا اپنا؟ خدا کا؟ یا واقعات کا؟

جرم کی صلاحیت انسان میں ابدی ہے یا وہ بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ٹیڑھی سی بات ہے۔ طرزِ فکر اگر صاف ہے تو قدم غلط نہیں اُٹھے گا۔ مگر میں اس کو قاعدہ کلیّہ نہیں مانتا۔ بعض دفعہ انسان گناہ از خود کرتا ہے اور بعض وقت اُس سے جرم کرایا جاتا ہے۔ لیکن اس کا محرک کون ہے؟ نفس؟ تو آیئے نفسِ مطمئنہ کے لئے دعا مانگیں، مگر وہ راضی بھی ہو اور ہم بھی اس سے راضی تو ہوں۔ اگر رضا اتنی آسان چیز ہوتی تو انسان کی تخلیق یا اس کا ارتقائی دَور اس کے اپنے لئے نہ ہوتا!

"کیا وقت ہے ــــ بوائے کیا وقت ہے ـــ" یہ حفیظ نے گھُٹی ہوئی آواز میں اس طرح دریافت کیا جیسے کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو۔ وہ پھر گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس بار اُس نے آدھی کھڑکی کھول لی اور اپنی ہیبت زدہ آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک تارا ٹوٹا اور دور تک اپنا جلد ختم ہو جانے والا نُور گھسیٹتا ہوا خلا میں فنا ہو گیا۔

اب حفیظ کو ہر طرف خون ہی خون نظر آنے لگا۔ صاف و شفاف

سڑک پر اس کو خون بہتا نظر آ رہا تھا۔ قمقموں سے روشنی کے بجائے لال لال لہو کی بوندیں برستی نظر آ رہی تھیں۔ دفعتاً اس کو ہوٹل کے دروازے پر ایک تانگہ نظر آیا اور چند منٹ میں معمولی رفتار سے اس کی کھڑکی کے نیچے سے نکلا۔ اس میں لال کپڑے پہنے ایک جوان عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا لباس بھی سُرخ تھا۔ کیا وہ بھی کسی کا خون کر کے آ رہی تھی حفیظ نے سوچا۔ نہیں وہ اسی ہوٹل میں کسی سیاسی، ادبی یا سماجی مفکر کی شبِ فرصت کو مصروف کرنے آئی تھی یا ممکن ہے کسی بے فکرے کو جرم و گناہ کی مشق کرا کے جا رہی ہو۔

قتل کے واقعہ پر ابھی چند گھنٹے گزرے تھے۔ اِس لئے حفیظ پر ابھی خوف، وہم اور سراسیمگی ہی طاری تھی۔ ملامتِ ضمیر میں ابھی وقت تھا۔ اور وہ وقت خوف کے پردوں میں چھپا ہُوا تھا۔ تمام رات حفیظ سخت ہیبت زدہ رہا۔ ایک لمحہ کے لئے نہ سو سکا۔ صبح ہوتے ہی اُس نے سوچا کہ جنگل میں نکل جائے اور سب کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔

جب وہ صبح کے دھندلکے میں باہر جھانک رہا تھا تو آمدِ آفتاب کا اہتمام اور نورِ صبح کی عظمت کا اس کو تصوّر تک نہ تھا۔ رات ختم ہو جانے کے

بعد دن، کام اور اس کے انجام کو لئے چلا آرہا تھا۔ شب ایک مرغی ہے جو تاریکی میں چھپ کر قسم قسم کے انڈے دیتی ہے اور دن ان انڈوں کو سہتا ہے۔

جب پہلا لوائے حفیظ کے کمرے میں داخل ہوا تو حفیظ اس طرح اچھل پڑا جیسے مقتول سیٹھ نے اس کا گلا آدبایا ہو۔ جیسے پولیس نے آکر اس کے ہتھکڑی ڈال دی ہو۔ اس نے گھبرا کر لوائے پر حملہ کرنا چاہا۔ مگر کرسی میں الجھ گیا۔ لوائے پہلے تو ڈر گیا۔ مگر اس نے بڑھ کر اس کو سنبھال لیا۔

"کیسی طبیعت ہے جناب آپ کی؟" آخر لوائے نے دریافت کیا۔

"کیا بجا ہے ــــ کیا بج گیا ہوگا ــــ" حفیظ نے کرسی پر گر کر اس طرح دریافت کیا جیسے وہ خود سے باتیں کر رہا ہو۔

"ساڑھے سات بجے ہیں۔ چائے لاؤں"؟

"چائے ــــ اچھا ــــ اچھا ــــ" حفیظ چپ ہو گیا۔ جب لوائے جانے لگا تو حفیظ نے مڑ کر اس سے دفعتاً پوچھا، "ذرا سننا لوائے ــــ وہ ــــ کیا ــــ کیا ــــ کبھی یہاں کوئی قتل ہوا ہے۔ کئی آدمیوں کو مارا گیا

ہے یہاں؟"

"قتل!" بوائے نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ہاں قتل۔ یہاں ـــــ اس تمہارے ہوٹل میں جو آکر ٹھہرتا ہے وہ قاتل ہوتا ہے یا مجرم۔" حفیظ نے دیوانگی سے کہا۔

"نہیں جناب ـــــ نہیں جناب ـــــ مجھے معلوم نہیں میں تو صرف چھ مہینے سے کام کرتا ہوں۔ میں جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر بوائے جلدی سے نکل گیا حفیظ نے ایک مجنونانہ قہقہہ لگایا۔

قتل کہاں نہیں ہوتے ـــــ سب جگہ ہوتے ہیں' خون سب جگہ بہایا جاتا ہے۔ میں نے بھی خون کیا ہے۔ حفیظ کے منہ سے نکلا اور اس نے گھبرا کر جلدی سے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ طبیعت اُبھری جیسے اُس کو قے ہونے والی ہو۔ فطرت لطافت کی طرف زیادہ مائل ہے۔ اگر اس پر کثافت حملہ کرتی ہے تو وہ ڈٹ کر اس کا مقابلہ کرتی ہے۔ مگر کثافت بھی تو اپنی جگہ پر کافی قوی ہے۔ وہ فطرت کو جکڑ کر رہتی ہے اور اس طرح اس کو دبوچ ڈالتی ہے۔ جیسے بلّی نے شکار کو پکڑ لیا ہو۔ شکار لیکن جب تک زندہ رہتا ہے کرب کی گنگناہٹ اس کے حلق سے نکلتی رہتی ہے۔

حفیظ نے اُٹھ کر پانی پیا اور اپنے حواس ذرا مجتمع کئے جب آہستہ آہستہ
اس کے منتشر اوسان ٹھکانے آنے لگے تو اسے شب بھر کی بیداری کی
کوفت اور جذباتی کشمکش کی تکان کا سختی سے احساس ہوا۔ پہلے اس کو
بھوک معلوم ہوئی اور اس کے ساتھ ہی بھوک کی سیری کے ذرائع کا دھیان
آیا اس کے پاس پیسے تھے سینما میں اس نے کسی اچھی جیب پر ہاتھ مارا تھا۔
اس لئے پیسے بھی اچھے ملے تھے۔ چنانچہ اس نے ان اچھے پیسوں سے
اچھا کھانا کھایا اور پھر اعضا کو آرام دینے کے لئے دراز ہو گیا۔ مگر چند ہی
منٹ بعد اس پر پھر خون آسوار ہوا۔

(۲۱)

وہ شخص کون تھا۔ جو مجھے سیٹھ کے مکان کی سیڑھیوں پہ قتل کے بعد اوپر جاتا ہوا ملا تھا۔ یہ خیال سوال بن کر پھر حفیظ کو آیا۔ اسے کہیں پہلے ضرور دیکھا تھا۔ وہ اس کا چیچک زدہ چہرہ، کالا رنگ بڑا سا ڈیل ڈول ضرور میری نگاہوں سے کہیں ٹکرایا ہے۔ حفیظ غور کرنے لگا۔ لیکن حافظہ پہ خون چھایا ہوا تھا۔ اس لئے اس کو یاد نہ آسکا کہ اُس شخص سے کہاں اُس کی ملاقات ہوئی تھی۔

بدکردار شخص کو فوراً ہی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس کی زندگی بدکرداری میں گزری تھی۔ اس نے شاید اپنی زندگی کی ابتدا بدکرداری سے نہ

کی ہو مگر نفس کی جکڑی ہوئی اور نامساعد واقعات کی پیدا کی ہوئی ضرورتیں اس کو اس قدر تنگ کر چکی تھیں کہ وہ ہجوم اُمید و بیم سے تنگ آ گیا تھا۔ اور اس نے شروع میں پورے احساسِ پستی کے ساتھ سب سے پہلا ایک چھوٹا سا جرم کیا تھا۔ جو بلا پاداش کے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اس کو حوصلہ ہوا اور اس نے دو چار اور جرم کئے۔ ان پر بھی قانون کی زد نہ پڑ سکی۔ ہاں ان کی تاریک سی پرچھائیاں چند لوگوں کے علم میں آئی تھیں چنانچہ ان کو دھوکا دینے کے لئے اور اپنے باب میں ان کا حسنِ ظن زندہ کرنے کی خاطر اُس نے ایک، دو کام کئے۔ یوں نیک کام جس کو نیکی کی خاطر نہیں کیا گیا بلکہ محض نمائش کے لئے، یہ چونکہ بجائے خود ایک جرم تھا اس لئے اس کی مجرمانہ صلاحیت بدستور برقرار رہ گئی۔ بلکہ اور پروان چڑھ گئی۔ اب وہ ایک اچھا خاصا مشّاق مجرم تھا۔

اسی دوران میں جب وہ ایک شب کو وقت گزارنے بھوری کے پاس آیا تو عادتِ پختہ کے مطابق مطلب براری میں اس کو مطلق باک نہ تھا مگر نہ معلوم کس طرح بھوری کی آہ و زاری بدکردار مردہ کی سڑی ہوئی فطرت کے اُس ایک ننھے سے لفظ پر جا بیٹھی جس میں لطافت آخری دم توڑ رہی تھی۔ بدکردار

مرد گھبرا گیا۔ اس کی کثافت جھلملانے لگی۔ کیونکہ الحاح کی تقویت سے وہ لطیف نقطہ برائے چندے اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ وہ مذموم عزم پر غالب آگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بدکردار مرد نے نہ صرف بھوری کو بخش ہی دیا۔ بلکہ مزید بدکرداروں کے خلاف اس کی حفاظت بھی کرنے لگا ـــــ یہی پہلے حفیظ کے ساتھ ہوا تھا۔ شیطان بنا ہوا انسان کبھی نہ کبھی انسانیت کی مار کھائے بغیر نہیں رہتا۔ اے انسان تو کیوں جُرم کرتا ہے!

بدکردار مرد پولیس کی حراست میں تھا۔ اسے قتل کے جرم میں ماخوذ کیا گیا تھا۔ بیشک اس نے بہت سے جُرم کئے تھے۔ لیکن قتل کا سنگین جُرم اس سے آج تک صادر نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ قاتل میں دو صفات ضرور ہونی چاہئیں۔ ایک تو وہ خطرناک کینہ توز ہو۔ دوسرے قسی القلب۔ بدقسمتی سے بدکار مرد کے حصّے میں یہ دونوں قسمیں نہیں آئی تھیں۔ مگر پولیس یا عدالت ہمیشہ جرم کی نوعیّت پر غور کرتی ہے۔ مجرم کی صلاحیّت کا لحاظ نہیں کرتی۔

"مَیں نے سیٹھ کو قتل نہیں کیا ہے۔ مَیں سچ کہتا ہوں۔ قاتل میں نہیں ہوں" بدکار نے عدالت میں چیختے ہوئے کہا۔

"پھر کون ہے؟" اس سے سوال کیا گیا۔

"میں اُسے نہیں جانتا۔ میں اس کی شکل اچھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا۔"

بدکار نے اپنی اپیل آپ کرتے ہوئے کہا۔

"کس کی؟"

"جس نے سیٹھ کو قتل کیا ہے۔" بدکار نے کہا۔

"کس نے قتل کیا ہے اس کو؟"

"میں نے کہا نا اس کو میں نہیں جانتا۔"

"پھر تم کیسے کہتے ہو کہ سیٹھ کو کسی اور شخص نے قتل کیا ہے۔"

"کیونکہ میں نے قاتل کو سیٹھ کی سیڑھیوں پر سے اُترتے دیکھا تھا۔"

"وہ بھاگتا ہوا اُتر رہا تھا؟"

"نہیں بلکہ اطمینان سے نیچے آ رہا تھا۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ قاتل اطمینان سے جرم کے بعد نہیں نظر آ سکتا بلکہ وہ بدحواس ہو کر بھاگتا ہے۔ اس لئے زینے پر سے کسی اُترنے والے آدمی کے وجود کو ہم تسلیم بھی کر لیں تو اس کو قاتل نہیں مان سکتے۔" عدالت نے کہا۔ بدکار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ اُس نے یہ کیا کیا

کیوں نہ کہہ دیا کہ ایک ہیبت زدہ انسان جس کے کپڑے خون میں رنگے ہوئے تھے۔ زینے پر سے اُتر کر بھاگا جا رہا تھا۔ بدکار مرد کتنا سچّا تھا اس نے وہی بیان کیا جو اس کا مشاہدہ تھا۔ عدالت نے اس کی سچائی کی کوئی قدر نہ کی۔ بیچارہ بدکار مرد۔ کیسا بدکار تھا وہ کہ نادانستہ طور پر نیک کرداری کی ہلکی ہلکی جھلکیاں دکھا رہا تھا۔ ہم سب ایسے ہی بدکردار ہیں۔

"اچھّا تم اُس شخص کو پہچان سکتے ہو؟"

"شاید نہیں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ میری نظر اس کی صورت پہ نہیں پڑ سکی تھی۔"

"کیوں؟"

"اندھیرا تھا زینے پر؟" اس کے وکیل نے اس کی مدد کرتے ہوئے کہا۔

"جی اندھیرا؟ کہہ نہیں سکتا۔ مجھے اندھیرے اُجالے کا کوئی خیال نہ تھا۔"

"کیوں؟" بدکار سے پوچھا گیا۔ وہ پھر برائے چندے چپ ہو گیا۔ وہ اپنی صدق بیانی کی بنا پہ اپنا بیان آپ بگاڑ رہا تھا۔ اس وقت سچ

بول کر عدالت و مخالف فضا کو نرم کرنے کی نیت نہیں رکھتا تھا۔ اور نہ عادتاً سچ بول رہا تھا۔ کیونکہ وہ سچ کا عادی بھی نہ تھا۔ مگر وہ بدکار تھا۔ اور بدکار ایسے ہی ہوتے ہیں بعض اوقات تو بدکرداروں کا کردار بڑے بڑے اللہ والوں کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔

"کیونکہ مَیں تو اپنے پریشان کُن خیالوں میں گُم تھا۔" اُس نے جواب دیا۔

"کیا خیالات تھے تمہارے؟ عدالت کو بتا سکتے ہو؟" اس سے دریافت کیا گیا۔ اِس بار وہ زیادہ دیر تک چپ رہا۔ یہاں تک کہ یہی سوال پھر دہرایا گیا۔

"مَیں نہیں بتا سکتا۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔

"اگر بتا دو گے تو ممکن ہے یہ چیز تمہارے بری ہونے میں مدد کرے۔" اس سے کہا گیا۔ تو "بری ہونے میں" کا لفظ سن کر بدکار مرد کے دل نے خوشی سے چیخ کر کہا۔ کیونکہ فوراً ہی بدکاری کی زندگی نے اُس کو زندہ رہنے کی ترغیب دی۔ وہ بول اُٹھا۔

"مَیں ایک لڑکی کے خیال میں گُم تھا۔"

"وہ تمہاری کون ہے؟ کوئی رشتہ دار؟ داشتہ؟ آشنا؟"

"نہیں وہ کسبی ہے۔ ایسی کسبی جو کسب نہیں کماتی۔" بدکار نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا ہم سمجھ گئے۔ تم اس کی کفالت کے لئے ہی شاید چوریاں، ڈاکے اور قتل کرتے ہو۔"

"یہ غلط ہے۔ افسوس میں آج تک اس کی کسی ذریعہ سے کفالت نہ کر سکا کیونکہ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ چوری سے روپیہ پیدا کرنے کی مجھ میں آج تک ہمت نہیں ہوئی اور قتل تو بہت بڑی چیز ہے اس کا مجھے شروع ہی سے حوصلہ نہ ہوا۔" بدکار نے کہا۔

"تمہارا ذریعۂ معاش کیا ہے؟"

"ذریعۂ معاش؟ کیا ہو سکتا ہے میرا ذریعۂ معاش۔ کیوں پوچھتے ہیں یہ آپ مجھ سے۔ حکومت نے اور معاش کے اجارہ داروں نے ہم جیسے لوگوں کے لئے کون سے ذریعے روزی کمانے کے لئے مہیّا کئے ہیں۔ کہ جنہیں اختیار کر کے ہم اپنے پیٹ بھر سکیں۔"

"عدالت کی توہین کر رہا ہے یہ شخص۔ می لارڈ۔" وکیلِ مخالف نے کہا۔

عدالت میں خاموشی چھا گئی۔ آخر جج کی آواز آئی۔

مُلزم کو اپنا بیان جاری رکھنے کی اجازت دی جاتی ہے:

"مجھے اور کچھ نہیں کہنا ہے۔" بدکار مرد نے کہا۔

"تمہارا وہ بیان ادھورا رہ گیا۔ تم مقتول کے مکان کی سیڑھیوں پر چڑھتے وقت کسی لڑکی کے خیال میں گُم تھے جو نہ تمہاری رشتہ دار ہے اور نہ داشتہ۔ نہ آشنا۔ کیا تم عدالت کو بتا سکتے ہو کہ تمہیں کن وجوہ کی بنا پر یا کن تعلّقات کے سبب اُس لڑکی سے ہمدردی ہے؟ تمہیں کیوں اس کا اس قدر خیال ہے کہ تم مقتول سے روپیہ قرض لینے جا رہے تھے مگر کھوئے ہوئے تھے۔ اُسی لڑکی کے خیال میں۔"

"حضور کا سوال بہت لمبا ہے اور اس میں کئی اور سوالات شامل ہیں" بدکار نے کہا۔

"کیا تم پڑھے لکھے آدمی ہو؟"

"جی معمولی سا۔ لیکن ابتدائی زندگی میں چند پڑھے لکھے آدمیوں کی صحبت میں ضرور رہا ہوں۔"

"اچھا پہلے یہ بتاؤ کہ تم کس کے لئے روپیہ قرض لینے گئے تھے مقتول سے؟"

"حضور کے اس سوال کے جواب میں میری پوری مختصر داستان آجاتی ہے۔ اجازت ہو تو عرض کروں"

"می لارڈ! یہ شخص بے سروپا باتوں میں عدالت کا قیمتی وقت ضائع کرنا چاہتا ہے۔" وکیل مخالف نے پھر اُٹھ کر کہا۔

"ملزم کو اپنا بیان پورا کرنے کی رعایت حاصل ہے۔" جج نے کہا۔

"حضور شہر میں اور بھی ایسی لڑکیاں ہوں گی۔ مگر وہ میرے علم میں نہیں۔ ہاں میں ایک لڑکی کو جانتا ہوں جس کو کچھ اس کی سوتیلی ماں نے کچھ افلاس نے کسبی کی زندگی کی طرف دھکیل دیا ہے۔ مگر وہ اپنے پیشہ سے سخت بیزار ہے اور حتی الوسع وہ اپنے کو بچاتی رہتی ہے۔ کچھ دن ہوئے اس کو ایک ایسا مرد مل گیا تھا جو بلا معاوضہ اس کی کفالت کرنے لگا تھا اور وہ اپنے پیشے سے برائے چندے نجات پا گئی تھی۔ وہ شخص کچھ دنوں کے لئے باہر چلا گیا۔ میں اس مغالطہ کی بنا پر کہ یہ پرائیویٹ کسبی ہے۔ ایک رات کو اُس کے ہاں پہنچ گیا۔ پوری فیس میں نے اس کی ماں کو ادا کر دی۔ مگر لڑکی نے رو رو کر میرے ارادہ کو توڑ دیا جب میں اس کے حالات سے باخبر ہوا تو مجھے بھی اس پر بے حد رحم آیا۔ اس کے

بعد میں نہ صرف اس کے پاس سے چلا گیا۔ بلکہ اس کے پہلے مرد کی طرح اور غنڈوں سے اس کی حفاظت کرتا رہا۔ اس کے پہلے مرد کا یہ وطیرہ تھا کہ وہ اس لڑکی کی روزانہ کی مقرّرہ فیس اس کی ماں کو ادا کر دیا کرتا تھا اور کسی دوسرے شخص کو اس کے پاس نہیں آنے دیتا تھا۔ وہ خود بھی ملوّث نہیں ہوتا تھا صرف اسے اس لڑکی کی حفاظت مقصود تھی۔ یہ تمام باتیں مجھے اُسی لڑکی سے معلوم ہوئی ہیں۔ جن کی تصدیق کے بعد میں نے ان کو سچ پایا۔ میرے پاس چونکہ پیسے نہ تھے۔ اس لئے میں صرف اپنے رعب اور قوّت سے غنڈوں کو اس کے گھر میں آنے سے روکتا رہا۔ اتنا کہہ کر بدکار مرد رک گیا۔ عدالت کو متوجہ پا کر پھر آگے بڑھا۔

کئی روز تک میں اس لڑکی کی اسی طرح حفاظت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک رات کو اس کا مرد بھی آ گیا۔ جس کو مَیں نہیں پہچانتا تھا۔ مَیں نے اس کو بھی روکا اور ڈانٹ کر بھگا دیا۔ اُس شخص کو یہ مغالطہ بلکہ بدگمانی ہوئی (جس میں واقعات سے بے خبر ہونے کی وجہ سے وہ حق بجانب تھا) کہ وہ لڑکی اب مجھ سے پھنس گئی ہے۔ چنانچہ غضب ناک ہو کر اس نے اس لڑکی سے بالکل ہاتھ کھینچ لیا۔ اور اس کے ہاں آنا جانا بالکل ترک کر

دیا۔ اب ادھر تو اس شخص کی کفالت ختم ہو گئی تھی اور میں دوسرے گاہکوں کو اس لڑکی کے ہاں آنے سے روک رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ اس کے ہاں فاقے ہونے لگے مَیں نے محسوس کیا کہ میں ایک ضروری جرم کو روک کر دوسرا جرم کر رہا ہوں لیکن مجھے یہ گوارا نہ ہؤا کہ وہ لڑکی معاش و ضرورت سے مجبور ہو کر اپنے ناپسندیدہ پیشے سے تباہ ہوتی رہے اس لئے اس کے واسطے روپیہ فراہم کرنے کی تجویز سوچنے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر سیٹھ سے قرض کی بھیک مانگنے روانہ ہؤا۔ اپنے لئے نہیں بلکہ ایک صحیح ضرورتمند لڑکی کے لئے ۔۔۔"

"سیٹھ نے انکار کیا ۔۔۔ تم اپنی آشنا کی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے اس قدر اندھے ہو رہے تھے کہ غصّہ میں تم نے اس کو قتل کر ڈالا۔ اس سے زیادہ اور کیا صاف بیان ہو سکتا ہے ایک قاتل کا۔" مخالف وکیل نے دخل دیتے ہوئے کہا۔

"تم نے اس سے پہلے بھی کوئی اور جرم کئے ہیں"؟ مخالف وکیل نے پھر کہا۔

"آپ کے سوال کا جواب دینے پر میں مجبور نہیں ہوں وکیل صاحب کیونکہ اگر مَیں نے پہلے بھی کوئی جُرم کئے ہیں تو اس وقت ان کے خلاف کسی کا استغاثہ یہاں موجود نہیں ہے۔" بدکار نے جواب دیا۔

"مگر پولیس کے رجسٹر میں تمہارا نام ضرور درج ہو گا۔" وکیل نے کہا۔

"یہ پولیس سے دریافت کیجئے۔"

"کیوں انسپکٹر صاحب" مخالف وکیل نے پولیس کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا: "اس شخص کا نام درج ہے آپ کے ہاں؟"

"جی ہاں۔" انسپکٹر نے جواب دیا۔

"کن جرموں میں؟"

"جوا، شراب، غنڈہ گردی کے سلسلہ میں۔"

"می لارڈ۔" مجرم کے وکیل نے مخالف وکیل کی بار بار مخالفت سے تنگ آکر کہا۔ وہ اپنی مدافعتی تقریر ختم کر چکا تھا۔ "می لارڈ۔ یہ بے محل بحث ہے میں عدالت سے درخواست کرونگا کہ میرے مؤکل کے بیان پر غور فرمائے۔ وہ شخص جو ایک مبتلائے افلاس اور مجبور لڑکی کو کسبی کی زندگی سے نجات دلانے میں اس قدر نیک خدمات انجام دے سکتا ہے کس طرح عادی مجرم اور مجرمانہ ذہنیت کا انسان ہو سکتا ہے۔"

"مجرم کا بیان قابلِ غور ہے اور تحقیق کا محتاج۔ اس لئے تاریخ فیصلہ بڑھائی جاتی ہے۔" جج نے کہا۔ اس کے بعد عدالت برخاست ہو گئی۔

(۲۳)

اس مقدمہ کے سلسلہ میں اخبار والوں کو ایک نیا مواد مل گیا تھا۔ جرم میں رفاہی خدمت لپٹی ہوئی ملی تھی۔ اس لئے انھوں نے مختلف سرخیوں کے ساتھ بدکار مرد کے پورے بیان کو خوب چمکا چمکا کر شائع کیا۔ عوام میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ گناہگاروں اور مجرموں کی برادری میں فخر و سربلندی کی ایک خاموش لہر دوڑ گئی۔ جُرم نشاں شراب کے پیالوں، جُوئے کی میزوں، چوروں کے ہاتھوں قاتلوں کے خنجروں، بدمعاشی کے اڈوں اور جرم و گناہ کی سیاہ تاریکیوں میں روشنی

سے کے دھبے سے پیدا ہونے لگے۔ مجرموں کی برادری کا ایک بدنام و بدکار فرد حمایت عامہ کے ساتھ پولیس کی زبان بن گیا تھا۔ اب نیک نام و نکوکار لوگ مجرموں کو نفرت، خوف اور حقارت کی نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔ اب وہ نہیں کہہ سکتے کہ مجرم ہمیشہ مجرم ہے۔ تر دامنی ہمیشہ تر دامنی ہے گناہگار ہمیشہ گناہگار ہے۔ جرم و گناہ اس لئے ہوں گے۔ کیونکہ یہ زندگی ہے اور نیک کام اس لئے ہوں گے کیونکہ ان سے زندگی میں رونق ہے، یہ حیات کی زینت ہیں۔ خون بہانے والا ہاتھ خون ہی سے مومیائی بھی بنا سکتا ہے۔

کیا ایک بدکار آدمی سے ایسے عملِ حسنہ کی توقع ہو سکتی ہے؟ یہ موضوع اب نیک و بد دونوں قسم کے لوگوں کی زبان پر تھا۔ نیک اس پر یقین نہیں کر رہے تھے۔ کیونکہ بدکار کی نیکی کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ جو کچھ اُس نے کہا تھا۔ اس کا اپنا بیان تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ محض STUNT یا شعبدہ گری ہو۔ لیکن بد قماش لوگ بلا ثبوت بدکار کے کارنامہ پہ فخر محسوس کر رہے تھے۔ گناہگار کی روح کس قدر لطیف ہو جاتی ہے۔

بدکار کی دوسری پیشی کو ابھی دس روز تھے۔ گویا اس کو دس دن زندہ رہنے کی اور مہلت مل گئی تھی۔ اس نے اِس عارضی زندگی سے کوئی فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کر بھی کیا سکتا تھا جیل میں بند تھا۔ جہاں اُس کی قاتل کی حیثیت سے کڑی نگرانی ہو رہی تھی۔ وہ اب نہ گناہ کے لیئے آزاد تھا نہ ثواب کے لیئے۔ ایک شخص کو ذلّت سے مارا جا رہا ہے۔ وہ عزّت سے مرنا چاہتا ہے۔ کوئی اس کی اِس خواہش کو پورا کرنے کے لیئے تیار نہیں ہے۔ وہ ذلّت کی موت پر خودکشی کو ترجیح دیتا ہے غیور لوگوں نے ہمیشہ عزّت سے مرنا پسند کیا ہے۔ مگر بدکردار کی مدد کون کرے۔ کس میں اتنا کس بَل ہے کہ وہ قانون کی بجائے حقیقتِ حال کا جائزہ لے کر اسے بچا لے۔

حفیظ کے سر پر خون سوار ہو کر بولے جا رہا تھا۔ ذرا سے کھٹکے پر اُسے محسوس ہونے لگتا تھا گویا کوئی چھپ کر اس کی نقل و حرکت کو دیکھ رہا ہے اور ابھی آ کر چپکے سے اس کو گرفتار کر لے گا۔ تین روز اُس نے ہوٹل میں ایسے گزارے جیسے وہ واقعی جرم قتل میں ماخوذ ہو کر قید کر دیا گیا ہو۔ اس کو نہ کھانے میں مزا آ رہا تھا نہ پینے میں۔

رات کو اُس نے شراب پی۔ خیال تھا کہ قلب و اعصاب پر سے خون کا بوجھ اُٹھ جائے گا۔ مگر شراب نے سرور کے بجائے اس کے جسم میں جرم کر دہ کو چنگاریوں میں بدل کر دوڑانا شروع کر دیا۔ بیخودی کے عوض وہ ہمہ آگاہی بن گیا۔ بوتل، ساغر، شراب اِن تینوں نے انسان کی شکل اختیار کر لی۔ بوتل مقتول سیٹھ کا دھڑ، پیالہ سر اور شراب خون بن گئی۔ وہ اچھل پڑا اور دیوانہ وار کمرے میں ناچنے لگا۔

تمام رات حفیظ سخت عذاب میں مبتلا رہا۔ تمام رات کیا وہ قتل کے بعد ہی سے شدید عذاب میں پھنس چکا تھا۔ اور اب ہر گھڑی اس پر عذاب بڑھتا جا رہا تھا، اگر کوئی اسے اِس حالت میں دیکھ لیتا تو ضرور اس کو گمان ہوتا کہ یہ شخص یا تو قاتل ہے یا مجرم۔ حفیظ نے اچھا ہی کیا کہ اپنے کو ہوٹل کے کمرے میں قید کر رکھا تھا۔

چوتھے روز اخبار والا لڑکا اس کے کمرے میں آیا۔ اُس نے اس طرح اخبار لیا جیسے یہ اُس کا وارنٹ گرفتاری ہو۔ اُس کی بے نور آنکھوں کو اخبار کے تمام صفحات خالی اور کورے نظر آئے۔ سورج کی تیز شعاعیں کھڑکی کے شیشوں کو چیرتی ہوئی اخبار کے بکھرے ہوئے صفحوں پر پڑ

رہی تھیں۔ حفیظ نے اُٹھ کر پانی پیا اور اخبار سے پنکھا جھلنے لگا۔ ایک دفعہ اُس کا ہاتھ رُکا نظریں تھمیں اور اس کی آنکھوں نے ایک موٹی سرخی کو پڑھا۔

جو کسی قتل کے مقدّمہ کی رپورٹ تھی۔ وہی قتل اور وہی قتل کا بیان۔ یہ چیز حفیظ کی درماندہ روح کی غذا بنی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تمام بینائی سمٹ آئی اور پورے انہماک سے وہ قاتل کا بیان پڑھنے لگا۔

ایک دفعہ نہیں کئی بار اُس نے اِس تفصیلی بیان کو پڑھا۔ دفعتاً اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُس نے ایک قتل اور کیا ہو بلکہ کئی قتل کے جرم کیئے ہوں۔ اس کا تمام جسم کپکپانے لگا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا آگیا اور وہ کرسی پر سے لڑھک کر زمین پر آ رہا۔ بہت دیر تک اس طرح پڑا رہا۔ جیسے اُس کی جان نکل گئی ہو۔ جیسے اس کے قلب کی حرکت بند ہو گئی ہو۔ اور یہ لاش یہاں کئی روز سے پڑی ہوئی ہو۔

وہ شخص کون تھا —— وہ آدمی کون تھا۔ بہت دیر کے بعد اس کے پپڑی جمے ہوئے ہونٹوں سے نکلا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کا جُرم سے دبا ہُوا دماغ بیدار ہُوا۔ اس کو دفعتہً یاد آیا کہ اس نے اس شخص

کو بھوری کے کوچے میں دیکھا تھا۔ نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اُس آدمی نے بھوری کے گھر میں جانے سے اس کو سختی سے روکا تھا۔ اور اسی بنا پر تو اُس نے خفا ہو کر اسی دن سے بھوری کے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔

بھوری — بھوری — بدکار مرد کو حافظہ میں پہچانتے ہی حفیظ کو بھوری یاد آئی۔ کئی دن کے بعد یاد آئی۔ اس کو یاد کرنے کی مہلت بھی کب ملی تھی حفیظ کو۔ وہ جرم اور ارتکابِ جرم کے عذاب میں ایسا مبتلا ہو گیا تھا کہ اس کا دماغ مختل اور روح بجھ گئی تھی۔ اس وقت بھوری کے باب میں بدگمانی کا پردہ چاک ہوتے ہی وہ اپنے جرم شدید اور اس کے کچل ڈالنے والے اثرات کو رائے چندے بھول گیا۔ پوری سرگرمی اور بے چینی سے اپنی بھوری کی یاد سے تڑپنے لگا۔

معصوم بھوری۔ کیسا بدگمان ہوا ہوں مَیں اس پیاری لڑکی سے۔ اور وہ بدکار مرد۔ الاماں! کس قدر جری، شریف اور قابلِ رشک نیک انسان نکلا ہے وہ مرد۔ وہ مرد مجھ سے بھی بازی لے گیا۔ مَیں تو روزانہ پیسے ادا کر کے بھوری کی حفاظت کر رہا تھا جس میں مجھ سے ناغے بھی ہوتے ہیں مگر اس شیر نے تنہا اپنے کو تمام خطرات میں ڈال کر صرف اپنی شجاعت اور کس بل سے

میری بیوی کی بے غرضانہ وللہیت کی بنا پر حفاظت کی ہے۔ مَیں نے اس معصوم لڑکی کی نگرانی اِس لئے بھی زیادہ کی کہ مَیں اُسے چاہتا ہوں مگر اس نیک مرد نے تو خالص نیک نیتی اور بغیر کسی غرض کے یہ سماجی خدمت انجام دی ہے۔ کِس قدر شجاع ہے وہ، کتنا بہادر، کیسا ایثار پیشہ ہے۔

حفیظ کا دماغ چکرانے لگا۔ مگر پھر بھوری کی یاد نے اس کو سنبھال لیا محبت جہاں چرکے اور زخم لگاتی ہے۔ وہاں یہ دنیا کی سب سے بڑی تقویت ڈھارس اُسرا اور تسکین صحیح ہے۔ محبت پھانسی کی سخت رسّی کو محبوب کی گداز و ملائم باہیں بنا دیتی ہے دل کے درد اور رُوح کی آگ سے جہنم کی آگ بھی ڈر کر سرد ہو جاتی ہے۔

بھوری کی محبت نے حفیظ کے مجرم جسم و رُوح کو دفعتاً اتنا سبک اور گوارا بنا دیا کہ وہ اپنے تمام عذاب کو بھول گیا۔ اس کو ایسا معلوم ہُوا جیسے اس کے جرم زدہ تنِ زار میں اب ایک گنہگار افسردہ رُوح نہیں بلکہ تند، شدید، سالم محبّت دہک رہی ہے اور جس جسم کے اندر محبّت دہک رہی ہو وہ کبھی محتاجِ روح نہیں رہتا۔

حفیظ کی ایکدم کایا سی پلٹ گئی۔ بھوری ـــــ کیسا کامیاب نسخہ تھا یہ

یہ نسخے ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں۔ اس نے فوراً اُٹھ کر غسل کیا، کپڑے بدلے، ناشتہ کیا اور اِس طرح باہر نکلا جیسے وہ سیدھا خدا کے دفتر سے نکل کر آرہا ہے۔ محبت نے اس کی انگلی پکڑی اور سیدھی اسے بھوری کے کوچے میں لے گئی۔

وہاں حفیظ نے دیکھا کہ بڑی بھیڑ ہے۔ جس طرح کسی قومی لیڈر کے درشن کے لیئے لوگ پہنچتے ہیں اسی طرح بھوری کی زیارت کو مرد و عورت جمع تھے۔ بدکار نے اپنے بیان میں اس لڑکی کا نام اور پتہ نہیں بتایا تھا۔ اس پر بھی لوگوں نے اس کو ڈھونڈھ نکالا۔ ممکن ہے اس باب میں انہی لوگوں نے سراغ رسانی کی ہو جن کو بدکار نے بھوری کے پاس جانے سے روکا تھا۔ معلوم ہوا کہ مظلوم بھوری کا انتقام لینے پولیس اس کی ماں اور باپ کو گرفتار کرنے آئی تھی، مگر وہ لوگ راتوں رات کہیں کھسک گئے۔ حفیظ نے پھر بھی تحقیق واقعہ کی خاطر ایک شخص سے دریافت کیا کہ کیا معاملہ ہے۔

"تمہیں نہیں معلوم۔" اُس نے کہا۔ "یہاں ایک عورت نے پوشیدہ طور پر چکلہ کھول رکھا تھا اور وہ اپنی سوتیلی لڑکی کے ذریعہ کما رہی تھی۔ وہ تو لڑکی ہی بڑی نیک معلوم ہوتی ہے کہ کسی کے بس میں نہیں آئی۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ لڑکی کسی کے بس میں نہ آئی؟" حفیظ نے پوچھا۔

"میاں اِتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ اور بھئی اُس نے ایک گُنڈے کو تیار کیا کہ کسو کو گھر میں نہ گھسنے دے۔"

"یہ باتیں تمہیں کس طرح معلوم ہوئیں؟" حفیظ نے پوچھا۔

"ساری مخلوق کہہ رہی ہے اور اخباروں میں بھی تھا۔"

"تم نے پڑھا ہے اخبار؟" حفیظ نے دریافت کیا۔

"سنا ہے پڑھوا کہ رمضانی بھٹیارے کے یہاں۔"

"لیکن یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ لڑکی کسی کے بس میں آہی نہ سکی ممکن ہے غنڈے کو مقرر کرنے سے پہلے کوئی اور اس کو خراب کرتا رہا ہو۔" حفیظ نے کہا۔

"یہ میں نہیں جانتا۔" اس شخص نے کہا۔

"تمہیں جاننا چاہیے۔ خود سوچو کہ ایک لڑکی جو ضرورتاً اپنی حفاظت کے لئے ایک غنڈے تک کو مقرر کرنے میں دریغ نہیں کرتی۔ وہ کس طرح خراب نہیں ہو سکتی ہے۔" حفیظ نے کہا۔

"ایں ہاں۔ پر میاں میں تو یہی کہوں گا کہ وہ گُنڈا بھی ہزار بھلے آدمیوں کا

ایک بھلا آدمی ہو گا۔جس نے ایسا کارِ ثواب کیا ہے۔

"کارِ ثواب!" حفیظ نے ہنس کر کہا۔ اس کے بعد اسے خیال آیا کہ وہ شخص نہ تنہا بھوری ہی کا محافظ رہا ہے بلکہ میرے لئے بھی صدقہ کا بکرا بن رہا ہے۔ وہ ایک دم سنجیدہ بن گیا۔ اور اس وقت بھوری سے ملنے کا موقع نہ تھا۔ اس لئے سر جھکائے واپس اپنی جائے قیام پر آ گیا۔

(۲۳)

حفیظ واپس اپنے ہوٹل میں آگیا۔ کچھ دیر پہلے تک اس پر جرم کی بزدلی طاری تھی۔ اس کا خواب خور حرام ہو رہا تھا۔ وہ اپنے سائے تک سے بدک اُٹھتا تھا اور پتے کی کھڑکھڑاہٹ سے دہل جاتا تھا۔ اُس کے جسم و روح کی یہ حالت تھی جیسے آگ کی تنگ قبر نے بھینچکر اُن کو کچل ڈالا ہو۔ لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کے جرم میں ایک وہ شخص ماخوذ ہو گیا ہے۔ جس نے بھوری کی بے غرضانہ حفاظت بھی کی تھی اور اسی کے لئے مقتول سیٹھ سے وہ روپیہ قرض لینے آیا تھا تو حفیظ کا مجرم ضمیر چیخ اُٹھا — یہ انتہا ہے — حد ہے نکو کاری کی۔"

کیا ایسے شخص کو صدقہ بن جانے دیا جائے؟ مگر پھر یہ بھی تو نہیں ہو سکتا کہ میں اپنے جرم کا اقرار کر کے پھانسی کے تختہ پر جا چڑھوں اور وہ بھی اس حالت میں جبکہ میری کھوئی ہوئی بھوری، میری بدگمانی کی ماری ہوئی لڑکی واپس مجھے مل رہی ہے۔

میں اب کوئی جرم نہیں کروں گا۔ کسی کو قتل نہ کروں گا بلکہ بھوری کو لیکر کہیں نکل جاؤں گا بستی سے دور۔ گناہوں اور جرموں سے آباد اس دنیا کو چھوڑ کر ہم کہیں محبت کی صاف ستھری زندگی گزاریں گے۔ پھر بھوری کو کسب کمانے اور مجھے چوری، ایذا رسانی اور قتل کی ضرورت نہیں رہیگی۔ مجھے ایک موقع اور دیا جائے صرف ایک موقع۔ مگر کیا اس حاصل کو وہ موقع کا میں بھوری کے مل جانے کے باوجود صحیح لطف حاصل کر سکوں گا۔ میں کس طرح کہہ رہا ہوں کہ آئندہ قتل نہ کروں گا۔ میری جگہ غریب بدکار کی جان لی جائیگی۔ اس کا قاتل کون ہوگا۔ کیا قانون؟ ہاں نارسا قانون اس کو قاتل سمجھ کر پھانسی پر لٹکا دے گا اور دوا دمیوں کو قتل کر ڈالنے والے پر شبہ تک نہ کریگا۔

شام تک حفیظ اسی قسم کے دارو گیر میں مبتلا رہا۔ اب وہ مجرم کم ہوتا جا رہا تھا اور جرم فہم و جرم پوش زیادہ۔ جب وہ کھانا کھانے بیٹھا تو سیٹھ کی موٹی اور

بھاری لاش اس کی قاب میں آگری۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اسے ہٹایا اور اس کے نیچے سے بدکار مرد کی لاش نکل آئی جو بالکل تازہ تھی اور اس میں سے اب تک خون بہہ رہا تھا۔ اس نے کھانا سرکا دیا۔ ہاتھ دھوئے اور لیٹ کر سگریٹ پینے لگا۔

جب اپنے جرم اور بدکار کی بے گناہی کی کشمکش اس کے دل پر سے کم ہوئی تو اُسے معلوم ہوا کہ اس کے ذمہ کچھ فرائض بھی ہیں۔ جنہیں ادا نہ کرنا تقریباً تیسرے قتل کے برابر ہے۔ مگر فرضوں کے درمیان محبت بھی آ پھنسی تھی۔ جو کبھی بغاوت، گاہے قانون شکنی اور اکثر مرگِ پروانہ کا مطالبہ کرتی ہے۔

حفیظ نے کھڑکی کھول دی۔ باہر سے شہر کی جُرم بھری ہوا آئی جس میں خون کی بُو بھی تھی۔ اور عصیاں کا تعفن بھی۔ وہ ٹہلنے لگا۔ رات کے نو بجے ہوں گے۔ بھوری صبح سے اس کے جسم میں لپٹی ہوئی تھی۔ تمام کشاکش جرم کے عذاب اور بدکار کی بگیناہی کے طاری کردہ اور رلا ڈالنے والے اثرات کے درمیان بھی بھوری ڈٹی رہی تھی۔ وہ اس کے انگ انگ کو جھنجھوڑ کر اپیل کئے جا رہی تھی کہ تیری جگہ مرنے کیلئے جس شخص کو واقعات نے دھکیل دیا ہے اس کو مر

جانے دے اور تو میرے پاس آ، اور کہیں مجھے لے چل۔ یہ محبت کی خودغرضی بھی ہے۔ عورت محبت کو پکڑے رہنے کی خاطر گناہ اور جھوٹ تک سے دریغ نہیں کرتی ہے۔

حفیظ کمرے کا قفل لگا کر باہر نکلا۔ روشنی نے اس کا لمبا لمبا سایہ آگے بڑھا دیا۔ جوہر قدم کے ساتھ آگے ہی بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ سامنے کی ایک روشنی نے اس کو پیچھے دھکیل دیا۔ حفیظ ڈرا۔ اس کا اپنا ہی سایہ تھا۔ سیٹھ کی لاش نہ تھی۔ بدکار مرد کی پرچھائیں بھی نہ تھیں۔ اس نے جلد جلد قدم اٹھائے اب سڑک کے بجائے گلی کوچوں سے گزرتا ہوا بھوری کے مکان پر جا پہنچا۔

اب تماشا ختم ہو چکا تھا۔ محلہ والے اور دوسرے لوگ ایک بیکس جیسی لڑکی کی پاکبازانہ جرأت سے خوش اور مغموم ہو کر صبح ہی جا چکے تھے۔ اب وہاں اکّا دکّا مغموم ہونے والوں میں سے کوئی شخص کبھی کبھی کسی موہوم اُمید میں چکر لگا لیتا تھا۔ اسے یہ اُمید تھی کہ بھوری کو پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ اچھے پیسے دے کر اس کے پاس اچھا وقت کیوں نہ گزارا جائے۔ لیکن بھوری کے دروازے کو چھونے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ یہ طلسمی دروازہ تھا۔ اس میں سے انسان عزمِ ذمیمہ کے ساتھ گزرتا تھا۔ اور جب نکلتا تھا تو بے نیلِ مرام نیک آدمی بن کر

نکلا تھا جس کی مہلک نکی فحش خانہ سے اُٹھ کر دار پر جا کر ختم ہوتی تھی۔

لیکن حفیظ ان تمام پُراسرار منازل سے گزر چکا تھا۔ اِس لئے کوچہ میں نہ تو اس کے قدم ڈگمگائے اور نہ دروازے کو چھونے میں ہاتھ کپکپائے۔ اُس نے بڑھ کر آہستہ سے کُنڈی کھٹکھٹائی۔ اتنے دھیمے کھٹکے سے بھی سنسان گلی گُونج اُٹھی۔ اور دُور کسی آدمی نے جھکے سے دوسرے سرے سے سر نکال کر جھانکا حفیظ نے اُدھر دیکھا۔ تو پھر غائب ہو گیا۔

اُس نے پھر کنڈی بجائی اب کے ذرا زور سے۔ گلی نے پھر اس کھٹکھٹاہٹ کو اُٹھایا۔ اب کے محلّہ کی دو ایک کھڑکیوں میں سے ایک دو سر نکلے "سالے اب بھی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔" کسی نے کہا۔ اس کے لہجہ میں حسرت تھی جیسے وہ بھی دروازے کو آزما چکا تھا اور ناکام رہا تھا۔

اندر پیروں کی ہلکی سی چاپ ہوئی اور کسی نے دروازے کے پیچھے سے شکستہ لہجہ میں کہا۔

"خدا کے واسطے — مجھ پر رحم کرو۔ کیوں دِق کر رہے ہو ایک بھکاری کو۔ جاؤ۔"

"بھوری۔" حفیظ نے کواڑ کی دراز پر لب رکھ کر آہستہ سے کہا۔ اندر خاموشی ہو گئی "بھوری۔ یہ تو مَیں ہوں۔" حفیظ نے پھر کہا۔ اندر پیروں کی آواز آئی جیسے وہ قریب آ رہے ہوں۔

"مَیں ہوں ــــ سُنا تم نے بھوری ـــــ حفیظ۔" حفیظ نے اپنا نام اس قدر آہستہ سے ادا کیا جس کو شاید اس نے خود بھی نہ سُنا ہو گا۔

"حفیظ!" اندر سے ایسی آواز آئی جیسے وہ انسان کے حلق سے نہ نکلی ہو بلکہ مُردہ نے خوشی سے بولنے کی کوشش کی ہو۔ اس کے بعد بہت آہستہ سے دروازہ کھُلا۔ معلوم نہیں حفیظ دروازہ میں سے داخل ہوُا یا کواڑوں کی دراڑ میں سے۔

"بلا لیا حرامزادی نے آخر یار کو۔" وہی ناکام آواز پھر آئی۔

اندھیرے میں جس زاویے سے بھی بھوری حفیظ کے ہاتھ لگی۔ اس نے اس کو پکڑ کر بھینچ لیا۔ پہلے اس کو ایک انسانی بُو سی آئی جو جلد مہک میں تبدیل ہو گئی۔ بھوری کی تو تمام ہستی حفیظ کے بازوؤں میں گم ہو گئی تھی۔ اندھیرا ان کو نور محسوس ہو رہا تھا اور وہ صاف صاف ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ تاریکی بینائی کا حجاب ہی تو ہے۔ مگر بینائی صرف آنکھ ہی میں نہیں رہتی ہے۔

"اُدپر چلو۔" آخر دونوں میں سے کسی نے آہستہ سے کہا۔

یہ وہی چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جس میں حفیظ نے نیکی کی کئی راتیں بھوری کے ساتھ گزاری تھیں اور ان نیکیوں کے انبار سے جرم، گناہ اور قتل کے پتلے نکلے تھے معلوم نہیں یہ نیکی کا قصور تھا یا نیکی آزمائی کے غیر اختیاری اور غلط نام پائے ہوئے نتیجے تھے۔ کوٹھڑی اب گندی تھی، یہاں کی ہر چیز کثیف اور میلی تھی۔ گناہ کو رو گئے

کے سلسلہ میں میلی نہیں ہوئی تھی بلکہ گناہ کی لاشوں کے سڑنے سے افلاس کی گندگی نے اس کو میلا کر دیا تھا۔

اسی طرح بھوری کا لباس بھی بیحد میلا اور جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اس کے کپڑوں نے بھی گناہ کو مسوسا تھا۔ اور یہ ایک خاصا جرم حسنہ تھا جس میں دامنِ یوسفؑ ہی نہیں بلکہ انسان کی تمام ہستی تک پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔

حفیظ نے ان تمام چیزوں کو دیکھا اور پھر اس کی نگاہیں بھوری کے تن زار پر پڑیں۔ جسم لاغر صرف اس وجہ سے ہو گیا تھا کہ اسے غذا نہیں مل رہی تھی غذا اس وجہ سے میّسر نہیں آ رہی تھی کہ پیسے نہیں تھے۔ اور پیسوں نے اس کے پاس آنے سے اس لئے انکار کر دیا تھا کہ اس نے ان کے عوض کسی طالب کو اپنا جسم بیچنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ بھی ایک اچھا خاصا جُرم تھا۔ مریمؑ کی قسم۔

"حفیظ تم کیا دیکھ رہے ہو اس کھوئے ہوئے انداز میں؟" بھوری نے اس کے شانے سے لپٹتے ہوئے آخر پوچھا۔

"کچھ نہیں بھوری، اپنی غلطیوں، خطاؤں اور جُرموں کے نشانات کو دیکھ رہا ہوں جو تمہاری معصوم ہستی پر اُبھر آئے ہیں۔" حفیظ نے کہا۔

"حفیظ تم کہاں تھے۔ کہاں چلے گئے تھے مجھے چھوڑ کر؟" بھوری نے محبّت سے اپنے لاغر ہاتھوں سے حفیظ کو گھیر لیا۔

"میں ایک بدگمانی کا شکار ہو گیا تھا۔ بھوری مجھے معلوم نہ تھا کہ بدکاروں کا بھی

ایک اخلاق ہے۔" اُس نے اس کے فاقہ زدہ جسم کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"ہوا کیا تھا مجھے بتاؤ تو۔"

"بہت کچھ ہو چکا ہے۔ مگر جتنا ہو چکا ہے اس سے زیادہ اب میں نہیں ہونے دونگا بھوری۔" حفیظ نے بھوری کے اُلجھے ہوئے خشک بالوں کو تھپتھپا کر کہا۔

"میری سمجھ میں تمہاری ایک بات نہیں آ رہی ہے۔ آہ حفیظ تم بھی کتنے دُبلے ہو گئے ہو۔ بیمار تھے کیا؟"

"سخت بیمار۔ شدید بیمار۔ اب بھی مرض الموت میں گھرا ہوا ہوں۔" حفیظ نے کہا۔

"ارے تم تو سچ مچ کپکپا رہے ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ نہیں لیٹ جاؤ میری گود میں سر رکھ لو۔"

کمزور ناتواں اور فاقہ زدہ بھوری میں اس وقت سورماؤں کی سی قوت پیدا ہو گئی۔ عورت فی الحقیقت تحت الشعور میں ماں ہی ہے۔ بھوری اس کا سر، جسم اور پیر دابنے لگی اور جیسے حفیظ مر رہا ہو اس کو آخری پیار کرنے لگی۔

حفیظ کئی منٹ تک اس راحت رساں علاج سے مغلوب پڑا رہا۔ کشمکش کرتے کرتے جسم و اعصاب چُور چُور ہو گئے تھے۔ اس کو نیند سی آ لے لگی قبل کے ابد سے یہ پہلا حقیقی اور میٹھا خمارہ تھا۔ نیند کا خمارہ جس کو اس وقت بھوری کی آغوش میں پا رہا تھا۔

آدھ گھنٹے بعد اُس نے کروٹ لی۔ آنکھیں کھولیں۔ بھوری اس کو سوتا سمجھ کر

اس عرصہ میں آگ جلانے کے بعد اس پر خالی پتیلی چڑھا آئی تھی جس میں صرف پانی گرم ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں اس تواضع سے وہ اپنے کو فریب دے رہی تھی یا حفیظ کو خوش کرنے کے لئے اہتمام کر رہی تھی۔

حفیظ اٹھ بیٹھا۔ آگ کے لال لال شعلوں کا عکس اس کی آنکھوں پر پڑ رہا تھا اور اس وقت یہ آنکھیں ایک خونی کی آنکھیں معلوم ہو رہی تھیں۔

"کیا کر رہی ہو بھوری۔ کیا چڑھا دیا تم نے پتیلی میں؟" حفیظ نے کھنکار بھری آواز میں پوچھا۔

"ارے تم جاگ گئے اتنی جلدی۔ اور سو لو۔ میں تمہارے پاس آتی ہوں۔ اچھی طرح آرام کر لو۔" بھوری نے چولہا پھونکتے ہوئے گردن موڑ کر کہا اور اس کی بے دلی آنکھوں میں محبت دھکنے لگی۔

"کچھ پکانے کی ضرورت نہیں ہے بھوری۔ میں یہ پراٹھے، کباب اور مٹھائی لایا ہوں۔ یہ ہم دونوں کے لئے کل تک کافی ہیں۔" حفیظ نے کہا۔ اور اٹھ کر چولھے کے پاس آ کھڑا ہوا۔ پھر بھوری کو گود میں لے کر جھکا تاکہ سرپوش اٹھا کر دیکھے کہ بھوری نے پتیلی میں کیا چڑھایا ہے۔

جیسے وہ اس کے جسم کا آخری کپڑا ہو بھوری نے تڑپ کر گرم گرم سرپوش پر ہاتھ رکھ دیا اور شرم و خوف کے درمیان مسکرا کر بولی۔

"اس کو نہ اٹھاؤ۔ سرپوش نہ سرکاؤ حفیظ۔"

"مَیں تو ضرور دیکھوں گا کہ کیا پکا رہی تھیں تم میرے لئے" حفیظ نے کہا۔ پھر بھوری کو دبوچ کر سرپوش اُٹھا لیا۔ جیسے بھوری برہنہ ہو گئی ہو۔ بھاپ نے تیزی سے نکل کر حفیظ کی آنکھوں پر ایک دھندلا سا پردہ ڈال دیا۔ کھولتا ہؤا پانی قہقہے لگا رہا تھا اور بلبلے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

حفیظ نے خالی پتیلی کو دیکھا۔ حقیقت فوراً اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس کو وُورِ فاروقی کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ مگر اب اس واقعہ کو دیکھنے کے لئے فاروقی آنکھیں نہ رہی تھیں۔

"میری اچھی بھوری۔ بیکس، بے سروسامان، فاقوں کی ماری ہوئی بچی" حفیظ نے اسے رحم و محبت کے شدید جذبات سے بھینچ لیا۔ بھوری شرم و ندامت سے رونے لگی۔

"دیوانی۔ اس میں پریشان ہونے کی کونسی بات ہے۔ کیا مَیں جانتا نہیں کہ تُو روزانہ فاقے کر رہی ہے۔ آج کل تیرا کوئی کفیل نہیں ہے۔ تیرے محلہ میں بڑے بڑے بیٹھو رہتے ہیں۔ جو بدہضمی کی حد تک روزانہ کئی کئی وقت تک کھاتے ہیں۔ مگر تیرے حصے میں اُن کی صرف حیوانی ڈکاریں سننا آیا ہے ۔۔۔" حفیظ کہنے لگا۔ مگر بھوری نے ہنس کر جلدی سے کہا۔ "نہیں حفیظ مَیں کئی روز سے فاقے نہیں کر رہی ہوں مَیں نے صبح ہی کھانا کھایا ہے۔ دیکھو وہ رکابیاں اب تک منی ہوئی رکھی ہیں۔" جو کچھ اُس نے کہا تھا غلط تھا۔ اس غریب کے جسم زار پہ آج تیسرا فاقہ تھا۔ مگر وہ جھوٹ بول کر ذلتِ فاقہ کشی کو مٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔

حفیظ ہنسنے لگا۔ اور اُسے ایک ہلکی سی چپت مار کر بولا۔

"جی ہاں کیوں نہیں۔ آپ کے لئے تو روز من وسلویٰ آجاتا ہے۔ مجھ ہی کو دھوکا دے رہی ہو۔ افسوس کتنی پیاری لڑکی کو کسبی بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس میں تو پوری نسوانی آن ہے۔ اچھا اب ادھر آؤ۔ اپنے پیارے ہاتھوں سے دسترخوان پر کھانا چنو۔ مجھے بھی بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔"

بھوری کمزوری سے ڈگمگاتے پیروں پر قابو پا کر مجبوریت سے اٹھی کھانا چنا اور دونوں نے ڈٹ کر کھایا۔ حفیظ آج حقیقی اشتہا کے ساتھ کھا رہا تھا گویا وہ اپنے چند روزہ رزق کو جلد جلد سمیٹ رہا ہے۔

"بس بس حفیظ۔" بھوری نے اس کے کھائے چلے جانے سے ڈر کر کہا۔ "کہیں خدانخواستہ تمہارا جی نہ بگڑ جائے۔ اب صبح کھانا۔" اس نے اس طرح اس کو زیادہ کھانے سے روکا جیسے ماں اپنے حریص بچے کو بخیالِ حفاظتِ ہاضمہ روکتی ہے۔

حفیظ ہنسا اور اُس نے کھانے پر سے ہاتھ کھینچ لیا۔

(۲۴)

حفیظ یہاں تین چار دن تک رہا۔ ڈرکس کا تھا۔ اب بھوری اس کی آشنا تھی۔ بلکہ پچھلے کئی ہفتوں سے عقد میں آچکی تھی۔ محلے والے شروع میں جھلائے مگر ان کو جلد معلوم ہو گیا کہ یہ تو وہی شخص ہے جو بھوری کو لے بھاگا تھا اور اس سے عقد کر چکا تھا۔ اب دونوں ایکدوسرے کیلئے حلال تھے۔ حرام حلال سے کس قدر متصل ہے!

حفیظ چوبیس گھنٹے میں گھر کی راحت محسوس کرنے لگا۔ جرم، افلاس، پریشانیوں کے درمیان اس کو بھوری کی بنائی ہوئی جنت مل گئی تھی۔ اس لئے اب اس کا دل بے نفسی کو چھوڑ کر خود غرضی کی طرف مائل ہونے لگا۔ جو سنگین جرم میں کر چکا ہوں اس کے متعلق اب تک کسی کا شبہ مجھ پر نہیں گیا ہے۔ میرے بجائے میرے جرم میں ایک دوسرا شخص ماخوذ ہو چکا ہے۔ اس کو کیوں نہ مرنے دیا جائے۔ میں کیوں گھر کی

ٹھنڈک، محبت کی ٹھنڈک اور بیوی کی راحت کو چھوڑ کر موت کی آگ کی طرف جاؤں اگر میں پھانسی پا گیا تو بھوری کی دیکھ بھال اور کفالت کون کریگا۔ اب حفیظ نے دوسری وجہ جواز کا سرا پکڑا۔ اپنی زندگی کے لئے وجہ جواز دوسرے طریقے سے نکالنے لگا۔

موت بُری چیز ہے حفیظ پھر سوچنے لگا۔ پھر یہ کون سی قوت ہے جو میری آسودہ راتوں، میرے نئے نئے گھر اور بھوری تک کے اندمال اثر مواجہہ میں در آ کر مجھے بدکار کی حمایت کے لئے اُکسا رہی ہے۔ کیا وہ میرا جرم ہے بیشک جُرم اور اس کے عواقب ہی مجھے کچلے جا رہے ہیں۔ بدکار مرد کی رہائی حقیقت تو کل میرے علم میں آئی ہے۔ میں تو لمحۂ قتل کے بعد ہی محسوس کر رہا ہوں جیسے نظر سے پوشیدہ قوتیں میرا تعاقب کر رہی ہیں۔ میرے سامنے مجسم آ کھڑی ہوتی ہیں مجھے کہتی ہیں کہ یاد رکھ جرم بھی اپنے چند اخلاق رکھتا ہے۔ اس کے بھی کچھ آداب ہیں۔ اس کی بھی ایک دُنیا ہے۔ اور یہ دُنیا اس کا اخلاق اور اس کا نظام ایسا ہے کہ جو مجرم اس میں آ کر اپنے کو گُم کر دینا چاہتا ہے۔ اس کو غدار سمجھا جاتا ہے اس کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنی پیشانی پر جرم کردہ کا لیبل لگا ہوا ہمیشہ پائے۔ کیونکہ جُرم و گناہ کے سلسلہ میں دوسرے دل کو دُکھ پہنچا کر راحت پانا یا راحت حاصل کرنے کی کوشش کرنا جُرم کی نفی کرنا ہے۔ مجرم کے مقدر میں پھر یہ نہیں رہتا کہ وہ ایک طرف سماج کا فرد اور دوسری طرف سماج کی عمارت ڈھانے والا بھی بنا رہے۔ ہر چند دو متضاد چیزوں کو مدغم کرنے سے ایک تیسری مخلوق پیدا ہو سکتی

ہے۔ مگر وہ دھواں ہو گی، اکارت ہو گی۔ رائیگاں شے ہو گی۔ جُرم ایک چبھن ہے کسک ہے ایک ٹیس ہے اور ان تمام کرب کو لے کر ایک مجرم صحت مندی کا حیلہ کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ ایک قوم میں چند صدیوں پہلے مجرم بعد ارتکابِ جرم سنگسار ہونے اور ہاتھ کٹوانے از خود دوڑتے چلے آتے تھے۔ اس کی وجہ خوفِ خدا، قوتِ ایمان اور عقبیٰ سنوارنے کی کوشش بتائی جاتی ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں۔ مگر پاداش کے لیئے ان کو آمادہ کرنے والا ان کا اپنا جُرم ہی ہوتا تھا۔ مخلوق کے خلاف ایک گناہ کر کے وہی گناہ ان کو دوسرے جرائم کی ترغیب دینے لگتا تھا۔ عیب کے لیئے بڑے ہُنر کی ضرورت ہے۔ جُرم کے ارتکاب میں بھی بڑی کاوش اٹھانی پڑتی ہے۔ اور بار بار کاوش کرنے میں انسان تحلیل ہوتا ہے چنانچہ وہ اس کے لیئے تیار نہیں ہوتا یعنی وہ جُرم سے بچنے لگتا ہے۔ لیکن جب اس صعوبت و کاوش کے باوجود انسان جُرم کیئے جاتا ہے، تو وہ مشّاق و بے باک تو ضرور ہو جاتا ہے لیکن دُور دُور تک پھیل جانے کی وجہ سے ہر وقت ضرر کے شدید و یقینی خطرے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

مجرم بننا بہت بڑی بات ہے۔ حفیظ کا ظرف اتنا وسیع نہ تھا کہ وہ جرم کو پی جاتا مجرم بن جانے کے بعد ظرف کی وسعت خود سُکڑ جاتی ہے۔ قتل تو بہت ہی بھاری چیز نکلی۔ اس کے بعد سے حفیظ کی زندگی افلاس بے زری، اپنی ہمشیرہ کی عزّت لٹ جانے کا خوف اور اپنی خود کی پچھلی پریشان زندگی سے بھی زیادہ بے اطمینانی

اور خوف کی ہو گئی تھی۔ وہ اب بھی میٹھی نیند کی آغوش میں، بھوری کی آغوش اور اپنے چند گھنٹے پہلے کے آباد کئے ہوئے نئے گھر کی راحت بخش فضا کی آغوش میں راتوں کو چونک چونک پڑتا تھا۔ اس کو محسوس ہوتا جیسے کسی کے کرخت ہاتھوں نے باہر زور زور سے کنڈی کھٹکھٹائی ہے۔ وہ نیند میں گشت کرنے والے مریض کی طرح اٹھ کر نیچے گیا، کنڈی کھولی۔ اور اُسے فوراً باہر کھڑے ہوئے سپاہیوں نے گرفتار کر کے ہتھکڑیاں پہنا دی ہیں۔ اس کے بعد اسے دار پر لے جایا گیا۔ پھانسی کا پھندہ اس کی گردن میں ڈالا گیا ہے اور ایک جھٹکے کے بعد وہ لٹک گیا ہے یعنی نیند سے بیدار ہو کر اور بھوری کے پہلو سے نکل کر زمین پر پڑا ہوا ہے۔ وہ وحشیانہ اٹھ بیٹھتا اور گرد و پیش کو مطلق بھول کر دیوانہ وار ادھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ غریب بھوری پہلے تو اس کو کوئی بیماری سمجھی۔ مگر یہ دورے جب حفیظ پر دن رات پڑنے لگے وہ سخت پریشان ہوئی اور ایک دن جبکہ حفیظ صحیح حواس میں تھا اس سے کہا۔

”حفیظ۔ یہ تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے۔ کس چیز کا ڈر تمہیں کھائے جا رہا ہے“؟

حفیظ نے اس کی گود میں تکان سے سر رکھ دیا اور بولا:۔

”بھوری یہ بہت خطرناک بیماری ہے۔ ایسی بیماری جس کا علاج کوئی نہیں کر سکتا۔ صرف میں ہی کر سکتا ہوں۔ مگر تم نے مل کر اور مجھے ایک آسودہ گھر بخش کر میری ہمتوں کو کمزور و بزدل بنا دیا۔ اب جس قدر یہ بیماری مجھے پریشان نہیں کرتی اس سے زیادہ اس کے علاج کا خوف میری روح کو گھلانے لگتا ہے۔“

"اچھے ہمت کرکے اپنا علاج کرلو۔ دیکھو نا تم کتنے کمزور ہوتے جارہے ہو۔" بھوری نے بیوی کی دردمندی کے ساتھ کہا۔

"علاج کرلوں! تم کہہ رہی ہو علاج کرلوں!" حفیظ نے پھانسی کو یاد کرکے خوف سے کہا۔

"گھبراؤ نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہمت بندھاتی رہوں گی۔ آپریشن ہوگا کوئی؟" بھوری نے سادگی سے پوچھا۔

"ہاں آپریشن۔ بڑا صحیح لفظ استعمال کیا تم نے بھوری آپریشن۔ ایسا آپریشن جس میں سو فیصدی مریض مرجاتا ہے اور اس کی یہ موت ایک آئینی موت سمجھی جاتی ہے۔"

"کیسی سمجھی جاتی ہے؟" بھوری نے دریافت کیا۔

"تم نہیں سمجھو گی۔ میرے آپریشن کے بعد بھی تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔" حفیظ نے کہا۔ پھر آہستہ سے بولا "لیکن تجھے کیسے چھوڑ دوں۔"

"تم سو جاؤ۔ آج تمہاری طبیعت بہت خراب ہے۔" بھوری نے اس کے سر کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"بھوری" حفیظ نے پھٹے پھٹے دیدوں سے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "تم نے اس بدکار مرد کو کیسا پایا تھا؟"

"کون وہ موٹا سا کالا سا چیچک رو آدمی؟ حفیظ اماں کی مہربانی سے وہ میرے پاس بہت بڑے ارادے سے آیا تھا۔ مگر یہاں سے بہت اچھے ارادے سے نکلا تھا

"یوں کہنا چاہیئے کہ اُس نے بھی وہی خدمت انجام دی جو میں تمہارے حق میں دنیا رہا تھا۔"

"بالکل" بھوری نے کہا۔ "صرف اُس غریب کے پاس پیسے نہیں تھے کہ اماں کی دوزخ کو بھرتا مگر اُس نے بڑی ترکیبوں سے میری حفاظت کی تمہیں حفیظ اس سے مل کر اس کا شکریہ تو ضرور ادا کرنا چاہیئے کیونکہ وہ تمہاری ناموس کا محافظ رہا تھا۔" بھوری نے اس کی بڑھی ہوئی داڑھی کی کھونٹیوں سے اپنے ہاتھ کی پشت کو کھرچتے ہوئے کہا۔ حفیظ اِس کلمہ سے ایکدم چونک پڑا۔ اور اس کے سامنے بدکار مرد کی لاش پھانسی کی رسّی سے لٹکتی اور پھڑکتی ہوئی آگئی۔ پھندے کے جھٹکے سے بدکار کی باہر نکلی ہوئی آنکھیں اُسے گھور رہی تھیں۔ وہ چیخ اُٹھا اور اُس کے منہ سے اس طرح آواز نکلی جیسے کسی نے گلا دبا دیا ہو" بھوری — مجھے بچاؤ۔"

رات بھر حفیظ پر بحرانی کیفیت طاری رہی۔ صبح جب اُس کو ہوش آیا تو یہ حالت تھی جیسے تمام جسم کی جان نکل گئی ہو۔ بھوری تمام رات اُس کی عیادت کرتی رہی مگر اس کی تیمارداری حفیظ کی رُوح میں اُترنے سے قاصر تھی۔ ہاں اُس کی محبت، حفیظ کو اپنے ارادوں سے ہٹا رہی تھی اور یہ چیز بجائے خود ایک سخت عذاب تھی۔

حفیظ پر ایک آہنی کشمکش مسلسل طاری رہتی تھی۔ کئی روز کے کرب سے تھک کر وہ صبح نڈھال پڑا ہوا تھا۔ جب جسم کمزور ہو جاتا ہے تو روح اس کی تلافی کے لئے قوت اختیار کر لیتی ہے۔ آج حفیظ بھی روحانی طور پر اپنے کو ذرا قوی محسوس کر رہا تھا۔

اس کی یہ کیفیت تھی جیسے مدتوں کے بیمار نے مرنے کے لئے سنبھالا لیا ہو۔ وہ اُٹھا منہ ہاتھ دھویا۔ بھوری گرم گرم ٹکیاں پکا کر لائی تھی۔ ان کو اس کے ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ اس کے بعد بھوری کی گود میں لیٹ کر سوچنے لگا کہ آیا وہ اپنی بیوی پر اس راز کو ظاہر کر دے کہ وہ ایک قاتل ہے اور اس کے عوض نیک بدکار قتل کے شبہ میں ماخوذ ہو چکا ہے اور وہ دو ایک دن میں پھانسی پانے والا ہے۔

پہلے تو اُس نے چاہا کہ سب کچھ بھوری کو بتا دے مگر خود بخود زبان بند ہو گئی۔ اگر قاتل جان کر بھوری نے بھی مجھے مستوجب سزا قرار دے دیا تو سخت روحانی تکلیف ہو گی۔ پھر بھوری میری پُر عذاب کشمکش کو سمجھ بھی تو نہیں سکتی ہے۔ کیا فائدہ اس سے کہنے کا۔ بہر نوع اُس نے بھوری کو مخاطب کیا اور بولا :۔

"بھوری ایک وعدہ کرو۔ اگر مَیں اپنی اِس موذی بیماری سے جانبر نہ ہو سکا تو تم میرے بعد بدکار کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدو گی"۔ غریب بھوری ایک محبت پرست بیوی کی طرح رونے لگی۔ حفیظ نے اس کو رو لینے دیا۔ اس کے بعد پھر اپنے الفاظ دُہرائے۔ بھوری نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور سسکیاں لیتی ہوئی بولی :۔

"تمہارے بعد میرا کون ہے حفیظ۔ مَیں بھی زندہ نہیں رہوں گی"۔

"نہیں بھوری تم کو زندہ رہنا پڑیگا اور بدکار مرد کو بھی۔ تاکہ تم دونوں کو دیکھ کر بدکاری سرنگوں ہو جائے اس کو میری وصیت سمجھو بھوری"۔ حفیظ نے کہا۔ اس کے بعد اُس پر پھر زندہ رہنے کی شدید آرزو کا دورہ پڑا۔ زندہ رہنے کا جھٹکا ــــــ

اپنے لئے، بھوری کیلئے، محبت کے لئے اور اس چہچہاتی آباد دنیا کے لئے۔

اِدھر جُرم نے اُسے زور سے دبوچا۔ خون نے اس کی جان میں نشتر بھونکنے شروع کئے۔ وہ تڑپنے لگا۔ پھانسی کیا چیز ہے ایک عارضی تکلیف۔ اس مستقل پھانسی کے مقابلہ میں بالکل ہیچ، حفیظ کی لہولہان رُوح چلاّئی۔ میرے لئے اپنے جرم کا اقرار کر کے پھانسی پالینا عین راحت ہوگی۔ حفیظ نے دل میں سوچا۔

دن کے بارہ بجے تھے حفیظ کو آفتاب کا دمکتا ہوا چہرہ کالا نظر آرہا تھا۔ بھوری نہانے کیلئے چلی گئی تھی۔ حفیظ اندھے کی طرح اُٹھا اور ٹٹولتا ہوا مکان کے باہر نکل گیا۔ وہ بھرے بازار میں، سڑک کے بیچ میں اس طرح چل رہا تھا۔ جیسے ایک بالکل اندھا اور نپٹ بہرا چلا جا رہا ہو۔ راستہ کا شور، گاڑیوں کی آوازیں۔ لوگوں کی چیخ پکار اس کے لئے سب ختم ہو چکی تھیں۔ یہاں تک کہ ایک موٹر نے اُسے کچل ڈالا۔

وہ شفاخانہ میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر اسے غلط جگہ سمجھ کر پھر چپ ہو گیا۔ اسکا دماغ بیدار ہو گیا۔ جسم سے نکلی ہوئی روح کو اُس نے اپنے دماغ میں قید کر لیا۔ اور کئی ڈاکٹروں کے سامنے قتل کی پوری روئداد مع ثبوت کے سنا کر اُس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ ساتھ ہی یہ اصرار بھی کیا کہ بدکار مرد بے گناہ ہے۔ اس کو پھانسی دنیا انصاف کا خون ہے۔ اس کو رہا کر دیا جائے۔ یہ دماغ کی مشین کا آخری کارنامہ تھا۔ اس کے بعد پورا کارخانہ زمین پر آرہا۔ حفیظ نے ایک ہچکی کے بعد دم دے دیا۔

تیسرے روز بھوری نے پھر کنڈی کی آواز سنی۔ وہ ننگے سر خوشی سے

سرشار اپنے حفیظ کو لینے دوڑی جب نیچے پہنچی تو باہر بدکار مرا کھڑا تھا۔ اس کے سفید حلیے کو فرشتے چوم رہے تھے۔ بھوری ششدر کھڑی رہ گئی۔

بدکار نے انتہائی رقّت سے چند لفظوں میں تمام باتیں بھوری کو سنا دیں۔ اس طرح سنائیں جیسے حفیظ ہی بول رہا تھا۔ ہاں حفیظ ہی بول رہا تھا۔ دونوں ذاتیں ایک ہی تھیں۔ دونوں مجرم تھے، دونوں ایک لڑکی کی حفاظت کے جرم کا ارتکاب کر چکے تھے۔ دونوں قاتل تھے۔ دونوں کی زندگی ایک تھی۔ بلکہ ساری مخلوق کی زندگی ایک ہی ہے، چہرے مختلف ہیں۔ بدکار بھی حفیظ تھا اور حفیظ بھی بدکار تھا۔ دونوں پھانسی سے بچ گئے کیونکہ ابھی بھوری غیر محفوظ تھی!

ہر شخص کو آنچ کی ضرورت ہے۔ تاؤ کی کسر نہیں رہنی چاہیئے!

محمد شریف عاجز ۔ گجرات ۔ جون ۱۹۶۰ء